ربیع الاول ۱۳۵۷ھ — جلد ۱۲ — عدد ۳

۸۶ ھ

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے — قیمت فی پرچہ ۸ آنے

صفحـــه خـــالی

ترجمان القرآن مفت

بکثرت حضرات ہم سے درخواست کرتے ہیں کہ رسالہ ترجمان القرآن انکی کم استطاعتی کو ملحوظ رکھکر مفت یا رعائتی قیمت پر دیا جائے۔ اب تک ہم نے محض اپنے مقاصد کی تبلیغ کی خاطر بہت سے لوگوں کیساتھ رعایت کی اور بہت سوں کو مفت بھی دیا۔ مگر ہماری مالی حالت اب مزید رعائت کی متحمل نہیں ہے اور ہمارے مقاصد سے ہمدردی رکھنے والوں کا بھی یہ فرض ہے کہ اس کام میں کسی نہ کسی حد تک ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ لہذا اعلان کیا جاتا ہے کہ

"جو صاحب ہم کو پورا سالانہ چندہ دینے والے ۵ خریدار مہیا کرینگے ان کو ایک سال تک رسالہ مفت دیا جائیگا۔ اور جب تک انکے فراہم کیے ہوئے خریداروں کی تعداد باقی رہیگی۔ اس وقت تک ان کو پرچہ برابر مفت دیا جاتا رہیگا۔"

جو لوگ اس شرط کو پورا کرنے سے معذور ہوں۔ انکی درخواستوں پر توجہ کرنے سے ہم معذور ہیں۔

منیجر

قواعد

رسالہ ترجمانُ القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعدِ اشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـ۱۰ـہ	صعـ۲۵ـہ	للعـ۴۵ـہ	لـ[illegible]ـہ
نِصف صفحہ	۶ـے	صعـ۱۵ـہ	صعـ۲۵ـہ	للعـ۴۵ـہ
رُبع صفحہ	للعـ۴	عـ۱۰ـہ	معـ۱۷ـہ	صعـ۲۵ـہ

۱ - کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیب و اخلاق اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲ - اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصول ہونی ضروری ہے۔

۳ - صرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴ - نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵ - ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ - مطابق ماہ مئی ۱۹۳۸ء - جلد ۱۲ - عدد ۳

باہتمام چودہری نیاز علی خان صاحب پرنٹر و پبلشر، گیلانی الکٹرک پریس لاہور میں

طبع ہوکر دارالاسلام نزد پٹھان کوٹ سے شائع ہوا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

قومیت اور جمہوریت کے نتائج سے آپ پچھلی صحبت میں روشناس ہو چکے ہیں۔ اب میں اس ناپاک تثلیث کے اقنوم ثالث، یعنی حکومت کے پارٹی سسٹم سے آپ کا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ یہ اُس جال کا آخری بند ہے جس میں پھنس جانے کے بعد صید زبوں کے لیے نقدِ جان ہار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔

حکومت کے پارٹی سسٹم سے مراد یہ ہے کہ انتخابات میں جو جماعت غالب اکثریت حاصل کرے اس کا سردار حکومت کا ناظمِ اعلیٰ، یعنی وزیرِ اعظم ہو، اور وہ صرف ان لوگوں کو وزارت میں شریک کرے جو اس پارٹی کے اصول اور نظام کی اطاعت قبول کر چکے ہوں۔ اس طریقہ کی بنیاد اور اسکی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ انتخابات میں پارٹی صرف ان لوگوں کو امیدوار کی حیثیت سے کھڑا کرتی ہے جنہیں وہ اپنے مقاصد کے لحاظ سے موزوں ترین سمجھتی ہو۔

۲۔ رائے عام کو پارٹی کا ہم خیال بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، تاکہ جو امیدوار کامیاب

ہو وہ اپنے شخصی اثر سے نہیں بلکہ پارٹی کے اثر اور اس کے اعتماد پر کامیاب ہو۔ بالفاظ دیگر کسی حلقۂ انتخاب میں کسی امیدوار کا جیت جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس حلقے کو پارٹی نے مسخر کر لیا۔

۳- اس طریقہ سے جب کسی پارٹی کو مجلس قانون ساز میں اکثریت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ اپنی کامیابی کو اس بات کی دلیل قرار دیتی ہے کہ قوم کی اکثریت اس پر اعتماد رکھتی ہے، لہذا اسے اپنی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلانے کا حق حاصل ہے۔

۴- مجلس قانون ساز میں پارٹی کے ہر رکن کو جماعتی نظام کی پوری پابندی کرنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی رائے اور عمل میں کسی قسم کی آزادی نہیں برت سکتا۔ وہ نہ کسی ایسی تجویز یا مسودۂ قانون کی مخالفت کر سکتا ہے جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، نہ حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کر سکتا ہے، نہ خود اپنی طرف سے کوئی ایسی تجویز یا مسودۂ قانون پیش کر سکتا ہے جسے پارٹی کی منظوری حاصل نہ ہو، اور نہ اس وقت تک پارٹی کے طریق کار میں کوئی ترمیم کرا سکتا ہے جب تک وہ پارٹی میں غالب اثر پیدا نہ کر لے۔ اگر پارٹی میں رہ کر وہ کسی قسم کی آزادی رائے استعمال کریگا تو اسے پارٹی سے خارج کر دیا جائیگا، اور دوسرے انتخاب میں وہ کسی ایسے حلقہ سے کامیاب بھی نہ ہو سکیگا جو پارٹی کے زیر اثر ہو۔

۵- جو شخص پارٹی کے اصول و مقاصد کا سب سے بڑا وکیل ہو، اور جس کو پارٹی کی عظیم اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، وہی اسکا لیڈر ہوتا ہے، اور اسی کے سپرد یہ کام کیا جاتا ہے کہ پارٹی کی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلائے۔

۶- وزارت کی ترتیب میں پارٹی کا لیڈر صرف ان لوگوں کو لیتا ہے جو نہ صرف جماعتی نظام کے پابند ہوں بلکہ جماعت کی پالیسی کے مطابق نظام حکومت کو چلانے میں سب سے زیادہ مفید و کارآمد ہوں۔ پارٹی گورنمنٹ میں کسی وزیر کے لیے یہ قطعی ناممکن ہے کہ وہ جماعتی پالیسی سے انحراف کر سکے

یا کسی ایسے مفاد کی حفاظت کا نام بھی لے سکے جو جماعتی مفاد کے خلاف ہو۔

اس طرح حکومت کا پورا اقتدار ایک جماعت کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ وہی جماعت اپنے حسب منشا قوانین بناتی ہے، اسی کے وزراء ان قوانین کو نافذ کرتے ہیں، اور اسی کی پالیسی کے مطابق حکومت کی مشین کے تمام کل پرزے حرکت کرتے ہیں۔ یہ جماعت جب تک اکثریت میں رہے، اسے اپنے کسی کام میں قلیل التعداد جماعتوں سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ مدد لینا تو درکنار وہ انکی رائے کی پروا کرنے پر بھی مجبور نہیں ہوتی۔

اس طرز حکومت کی بنا، دراصل قومیت اور جمہوریت کے اصولوں پر ہے جس ملک میں ایک قوم رہتی ہو، اور جہاں جمہوریت کی بنیاد مستحکم ہو چکی ہو، صرف اسی ملک میں ایسا طرز حکومت جائز طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہندوستان میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یہاں اس طرز حکومت کو اس لیے اختیار نہیں کیا گیا ہے کہ درحقیقت یہاں ایک قوم رہتی ہے اور جمہوریت کی بنیاد موجود ہے۔ بلکہ یہاں اسکو اسلیے اختیار کیا گیا ہے کہ ایک جماعت اس کے ذریعہ سے حکومت کا کلی اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے تاکہ حاکمانہ اقتدار سے کام لیکر ہندوستان کی مختلف قوموں کی قومیتیں مٹا سکے اور ان کو ایک ایسی قومیت میں مدغم ہو جانے پر مجبور کر دے جسکی وضع و ہیئت اور جسکی تہذیبی و تمدنی صورت متعین کرنے کا اختیار تمام تر اسی برسر اقتدار جماعت کے ہاتھ میں ہو۔

دن کی روشنی میں جو چیز امر واقعی کی حیثیت سے موجود ہو، اس سے کوئی آنکھوں والا انکار نہیں کر سکتا۔ واقعات تو یہ ہیں کہ:

۱- کانگریس پارٹی ہندوستان میں جہاں کہیں کامیاب ہوئی صرف ہندوؤں کے ووٹوں سے کامیاب ہوئی، مسلمانوں میں اس کو بحیثیت مجموعی پانچ فی صدی سے زیادہ ووٹ نہیں ملے۔ اسکے صاف معنی یہ ہیں کہ اسکو ملک کی آبادی کے صرف ایک حصہ کا اعتماد حاصل ہے، اور چند صوبوں کی مجلس قانون ساز میں اسکی اکثریت محض اس بات کا نتیجہ ہے کہ ان صوبوں میں وہ قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے جسے اس پارٹی پر اعتماد ہے۔

۲- اسکے ارکان تمام تر ہندو ہیں اور "مسلمان" اس میں آٹے میں نمک کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳- اس میں کسی غیر ہندو کو لیڈر کی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ باوجودیکہ ایسے متعدد غیر ہندو اس پارٹی میں موجود ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو "ہندی قومیت" میں پوری طرح جذب کر دیا ہے، جو اپنی قوم سے قریب قریب کٹ چکے ہیں، اور جنکی خدمات بھی کسی ہندو کانگریسی سے کم نہیں ہیں، مگر ابھی تک چونکہ انہوں نے اپنے نام نہیں بدلے ہیں، اور ابھی تک غیر ہندو قومیت سے تعلق رکھنے کی بُو اُنکے ناموں سے آرہی ہے، اسلیے ان میں سے کسی کو ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں پارٹی لیڈر بننے کا شرف حاصل نہ ہو سکا۔ مسٹر نریمان اور ڈاکٹر محمود کی مثالیں اسکی نمایاں ترین مثالیں ہیں۔ اگر ایک کا نام مسٹر کھیر اور دوسرے کا مسٹر سنہا ہوتا تو یقیناً یہی اپنے اپنے صوبوں میں پارٹی لیڈر ہوتے۔

۴- اس پارٹی کی ذہنیت اور اسکے طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اپنے نظام میں اگر کسی غیر ہندو کو اثر و اقتدار کی کوئی جگہ دیگی بھی تو صرف اُس وقت جبکہ اسے اس امر کا پورا اطمینان حاصل ہو جائے کہ وہ پارٹی کے مفاد کی خدمت، ایک ہندو کی بہ نسبت زیادہ بہتر طریقہ سے کر سکے گا، مثلاً غیر ہندو قوموں کو فریب دینا، یا تعلیم اور تہذیب و تمدن کے مسائل میں پارٹی کی پالیسی کو غیر ہندو قوموں پر نافذ کرنا۔ اس باب میں کانگریس پارٹی کا وہی حال ہے جو انگریزی حکومت کا حال ہے کہ وہ کسی ہندوستانی کو بڑے ذمہ دارانہ عہدے صرف اسی حالت میں دیتی ہے جب اسے یہ توقع ہو کہ وہ انگریزی

امپیریلیزم کی خدمت انگریز کی بہ نسبت زیادہ اچھی طرح انجام دیگا۔ اگر وہ کسی ہندوستانی کو گورنر یا وائسرائے بنائے تو یہ اس بات کا ثبوت نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں کے حق میں اسکی پالیسی بدل گئی ہے، بلکہ دراصل یہ اس بات کا ثبوت ہوگا کہ ہندوستانیوں میں اسکو اتنا بڑا غدّار مل گیا ہے جسکی غداری پر انگریز کی وفاداری سے بھی زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

مگر ان صریح حقائق کے باوجود کہا یہ جاتا ہے کہ:

۱۔ کانگریس پارٹی، ہندو پارٹی نہیں ہے بلکہ "قومی پارٹی" ہے، یعنی اُس "قوم" کی پارٹی ہے جو ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسری قوموں سے مل کر بنتی ہے۔

۲۔ اس پارٹی کا اکثریت میں ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اسکو "قوم" کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہے۔

۳۔ اس دلیل سے وہ انگلستان کی طرح ایک پارٹی کی حکومت قائم کرنے میں حق بجانب ہے۔

۴۔ اس پارٹی کی موجودگی میں ہندوستان کی کسی قوم کو مجالس قانون ساز میں اپنی الگ پارٹی بنانیکا حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ اسکے نمائندوں کو کانگریس کے عہد نامے پر دستخط کرکے کانگریس پارٹی کے نظام کا ایک جزء بن جانا چاہیے۔

۵۔ اگر غیر ہندو قومیں اپنی الگ پارٹیاں رکھنے پر اصرار کرینگی تو کانگریس پارٹی انکے ساتھ مخلوط وزارت نہیں بنائیگی، بلکہ صرف اپنی پارٹی کی وزارت بنائیگی اور اس وزارت میں صرف اُن غیر ہندو اشخاص کو لیا جائیگا جو پارٹی کے نظام میں جکڑے ہوئے ہوں یا وزارت کے لالچ میں اپنے آپکو خود جکڑوالیں۔ دوسرے الفاظ میں اسکا مطلب یہ ہے کہ قلیل التعداد اقوام میں سے کسی قوم کو بحیثیت ایک قوم کے حکومت میں حصہ دار نہیں بنایا جا سکتا، بلکہ انکے افراد کو صرف انفرادی حیثیت سے

حکومت کا خادم بنایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ وہ پارٹی کی اطاعت کا حلف لیں، ورنہ "قومی" وزارت بغیر اسکے بھی بن سکتی ہے کہ کوئی غیر ہندو اس میں شریک ہو۔

یہ انگریزی راج کی حمایت و حفاظت میں ہندو راج قائم کرنے کی بہترین تدبیر ہے۔ جیسا کہ میں اوپر ظاہر کر چکا ہوں، موجودہ حالات میں اس امر کی توکبھی توقع ہی نہیں کی جاسکتی کہ ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں کوئی غیر ہندو، پارٹی لیڈر بن سکے گا، اور پارٹی میں غیر ہندو ارکان کو اتنا اثر حاصل ہوسکیگا کہ جماعتی نظام اور اسکی پالیسی کو وہ کم از کم اپنے قومی مفاد کے خلاف نہ بننے دیں۔ ایسی حالت میں اگر پارٹی سسٹم کی حکومت کو درست تسلیم کر لیا جائے تو اس کے دو پہلو ہونگے، اور دونوں یکساں مضر ہونگے:

۱- اگر مسلمان اپنی علحدہ پارٹیوں کو توڑ کر نام نہاد "قومی پارٹی" میں ضم ہو جائیں تو انکی اپنی جماعتی حیثیت ختم ہو جاتی ہے کیونکہ وہ پارٹی کے ڈسپلن میں جکڑ دیے جائینگے، اور ڈسپلن کے خلاف کوئی آواز بلند کرنا، یا کوئی تجویز اور مسوّدۂ قانون اپنے قومی مفاد کے لیے بطور خود پیش کرنا، یا پارٹی کی کسی ایسی تجویز اور مسوّدۂ قانون کی مخالفت کرنا، جو انکے قومی مفاد کے خلاف ہو، ان کے لیے ناممکن ہوگا وزارت میں بھی کسی مسلمان کی شرکت مسلمانوں کی اجتماعی تائید و رضا پر نہیں بلکہ پارٹی کے ہندو لیڈر اور پارٹی کی ہندو اکثریت کے معیار انتخاب پر مبنی ہوگی، اور غیر ہندو کے لیے ان کا معیار انتخاب اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ یا تو وہ ہندی قومیت میں جذب ہو چکا ہو، یا پھر ایک وفادار خادم کی حیثیت سے کام کر سکے، چاہے اپنے گھر پر تفسیر قرآن ہی کیوں نہ لکھتا ہو۔ اس طرح قانون سازی اور تنفیذ قانون، اور سرکاری پالیسی کی تشکیل سے مسلمان اور تمام غیر ہندو عملاً بے دخل ہو جاتے ہیں۔

۲- اگر مسلمان اپنی علحدہ پارٹیاں قائم رکھیں تب بھی نہ تو حکومت کے اثر و اقتدار میں انہیں کوئی حصہ مل سکتا ہے، اور نہ قانون سازی میں وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے کوئی مؤثر طاقت استعمال کر سکتے ہیں

لیکن یہ دونوں پہلو بھی صرف اس وقت تک نمایاں ہو رہے ہیں جب تک انتخاب، جداگانہ ہے اور اس میں مسلمانوں کو اپنی قومی خواہش اور رائے کے اظہار کا موقع مل رہا ہے۔ جب یہ چیز باقی نہ رہیگی تو کسی کے لیے یہ کہنے کا موقع بھی باقی نہ رہ سکیگا کہ فلاں کام محض اکثریت کے زور پر مسلمانوں کی مرضی کے خلاف کیا گیا، بلکہ اس وقت تو خود مسلمانوں ہی کے نام سے وہ سب کچھ ہوگا جو "قوم پرست" کرنا چاہتے ہیں۔ اسی غرض کیلیے وہ کوشش کر رہے ہیں کہ جداگانہ انتخاب کو مخلوط انتخاب سے بدل دیا جائے، اور جب تک جداگانہ انتخاب باقی ہے، اسکے اثر کو باطل کرنیکے لیے انہوں نے مسلم ماس کانٹیکٹ کی تحریک شروع کر دی ہے، تاکہ وہ اپنی پسند کے "قوم پرست مسلمانوں" کو عامۂ مسلمین کے ووٹوں سے منتخب کرا سکیں۔

یہاں پہنچ کر آپ بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ جس جدوجہد کو تمام ہندوستان کیلیے جنگِ آزادی قرار دیا جا رہا ہے اسکی تمام اخلاقی و مادّی طاقتیں کس طرح محض ایک قوم کی آزادی اور باقی تمام قوموں کی غلامی ــــ پہلے سے بدتر غلامی ــــ کیلیے استعمال کی جا رہی ہیں۔ قومیت، جمہوریت، اور پارٹی سسٹم کے اصول صرف اسلیے اختیار کیے گئے ہیں کہ وہ ہندو قوم کو ہندوستان کی حکمراں قوم بنانے کے لیے سب سے زیادہ مفید ہیں۔ اگر ان اصولوں کو تسلیم کر کے ہم جنگ آزادی میں شریک ہوں تو اسکے معنی دراصل یہ ہونگے کہ ہم انگریز کی غلامی کو ہندو کی غلامی سے بدلنے کے لیے جنگ کریں!

فریب تو دیکھیے، پہلے ہندوستان کو ایک قوم فرض کیا جاتا ہے، تاکہ اس مفروضہ پر جمہوریت، اور جمہوریت پر پارٹی سسٹم کی حکومت قائم کی جا سکے۔ پھر جب جمہوریت اور پارٹی سسٹم کے ذریعہ سے حکومت کا اقتدار سمٹ کر ایک جماعت کے ہاتھ میں آجاتا ہے، تو اسکو ہوشیاری کے ساتھ تعلیم کی نئی تجاویز، زبان و رسم الخط کی تدریجی ترمیم، قوانین معاشرت کی شکست و ریخت،

اور معاشی وسائل پر قابو حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، تاکہ ان طاقتوں سے کام لیکر ایک "قوم" بنائی جاسکے۔ یہ ایک منحوس چکر (Vicious Circle) ہے جو فریب سے شروع ہو کر ظلم پر ختم ہوتا ہے اور پھر ظلم سے شروع ہو کر فریب پر جا پہنچتا ہے۔ اس چکر میں ہندوستان کی قلیل التعداد قوموں کو پھانسنے کا نام "جنگ آزادی" رکھا گیا ہے!

اب سے دس سال پہلے جب نہرو رپورٹ مرتب ہوئی تھی، اسی وقت معلوم ہو چکا تھا کہ "آزادی" کے ان علمبرداروں کی اصلی نیت کیا ہے۔ جن کو خدا نے عقل دی تھی وہ اسی وقت سمجھ چکے تھے کہ انگریزی سنگینوں کی حفاظت میں ہندو راج قائم کرنے کا نام "سوراج" رکھا گیا ہے، اور ان لوگوں کی تمام جدوجہد اسی قسم کے سوراج کے لیے ہے۔ یہی نقشہ جس پر آج ہندوستان کے نظام سیاست کی تعمیر ہو رہی ہے، نہرو رپورٹ میں پیش کیا گیا تھا۔ یہی قومیت کا مفروضہ تھا۔ یہی جمہوریت کے اصول تھے۔ اور اسی طرح حکومت کے پورے اقتدار کو ایک جماعت میں مرکوز کر دینے کی تجویز تھی۔

جب مسلمانوں کی تمام جماعتوں نے بالاتفاق اسکو رد کر دیا تو لاہور کانگریس میں اس رپورٹ کو غرقِ دریا کر کے "آزادی" کا علم بلند کر دیا گیا۔ جاننے والوں نے پھر کہا کہ یہ محض ایک فریب ہے۔ ان لوگوں کا اصل مقصد وہی ہے جسکا اظہار یہ اپنے مجوزہ دستور اساسی میں کر چکے ہیں، اور اب یہ آزادی کا علم محض دھوکا دینے کیلیے بلند کیا جا رہا ہے۔ مگر مسلمانوں کے دو طبقے جو سب سے زیادہ کمزور تھے اس آزادی کے نزلے سے ماؤف ہو گئے۔ ایک وہ طبقہ جو مغربی تعلیم و تہذیب کے اثر سے اسلامی قومیت کے احساس کو کھو چکا ہے اور ہر چیز کو اپنی معاشی فلاح کے عوض بیچنے پر تیار رہے۔ دوسرا ان علماء کا طبقہ جو زمانۂ جدید کی سیاسی چالوں کو سمجھنے سے طبعاً معذور ہیں۔ ان دونوں طبقوں پر آزادی کے جھنڈے

کا وہی اثر ہوا جو جنگ صفین میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی فوج پر لشکر معاویہؓ کے نیزوں سے قرآن لٹکتے دیکھ کر ہوا تھا۔ اُس وقت بھی مسلمانوں کی قومی کمزوری کا صحیح اندازہ لگا کر ناجائز فائدہ اٹھایا گیا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا۔ اس وقت بھی مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی نے اسلامی تاریخ کا رُخ ہمیشہ کیلیے بدل دیا، اور اب بھی جو غلطی ہوئی اور ہو رہی ہے وہ کم از کم ہندوستان میں اسلامی تاریخ کا رُخ پہلے سے بھی زیادہ افسوسناک نتائج کی طرف پھیرتی نظر آتی ہے۔ یہ لوگ آزادی کے جھنڈے کو دیکھ کر دیوانہ وار اس کی طرف لپک گئے، اور انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے اور غیر سب پر اپنی قوم کی اس کمزوری کا راز فاش کر دیا کہ کتنی آسانی کے ساتھ اس قوم میں پھوٹ ڈالی جا سکتی ہے اور کتنی آسانی کے ساتھ ہر فریب کار دشمن کو اس قوم میں سے اپنے مطلب کے ہزاروں آدمی مل سکتے ہیں۔

ان دو گروہوں کی نادانی سے اتنا بڑا نقصان ہم کو پہنچ چکا ہے جسکی تلافی اب بمشکل ہو سکتی ہے، اور اس سے زیادہ بڑا نقصان اب پہنچنے والا ہے جسکی تلافی شائد بمشکل بھی نہ ہو سکے گی۔ مختصر الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو مسلمان سخت پراگندگی و انتشار میں مبتلا ہو گئے، آنے والے خطرات کے مقابلہ میں انکو منظم کرنے کے لیے کوئی کوشش نہ کی جا سکی اور انکی قومی زندگی کے ایسے پندرہ سال خام کاریوں میں ضائع ہو گئے جن کا ایک ایک لمحہ فیصلہ کن تھا۔ دوسری طرف ہمسایہ قوم اپنی منظم جدوجہد اور خود مسلمانوں کی امداد و اعانت سے انگریزی سلطنت کو مرعوب کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ نہرو رپورٹ میں جس نصب العین کا انہوں نے اظہار کیا تھا، دس سال کے بعد ظاہر ہو گیا کہ آج بھی وہی نصب العین انکے سامنے ہے، بلکہ اس نصب العین کی پہلی منزل پر وہ پہنچ بھی گئے اور اب آخری منزل ان سے بہت قریب ہے۔ دستور جدید کی رو سے صوبوں میں جو حکومتِ خود اختیاری عطا کی گئی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے ٹھیک اسی نقشہ پر مستقبل کے ہندوستان کی تعمیر شروع

کر دی ہے جو دس سال پہلے وہ بنا چکے تھے، اور اب اُن کا قدم اپنی آخری منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا ہے، یعنی یہ کہ مرکزی حکومت پر بھی ان کو اقتدار حاصل ہو جائے، تاکہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انکی حکومتوں کو بھی مرکزی اقتدار کے واسطے سے قابو میں لاکر "سوراج" کے نصب العین —— ہندو راج زیر سایۂ سلطنت برطانیہ —— کی تکمیل کر دی جائے۔

مگر یہ نتیجہ سامنے آجانے کے بعد بھی ہمارے آزادی کے دیوانوں کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ فرعون کے گھر میں بچۂ فرعون نشوونما پا رہا ہے اور عنقریب ولی عہدی کی رسم ادا ہونیوالی ہے۔ مگر یہ سادہ لوح اب بھی ہندوستان بھر میں مسلمانوں کو یقین دلاتے پھر رہے ہیں کہ فرعون کے ہاں موسیٰ پرورش پا رہا ہے۔ وہاں آپکی قومیت کو ختم کر دینے کے لیے ذبحِ اطفال سے زیادہ خطرناک اور زیادہ کارگر پالیسی پر عمل درآمد شروع ہو چکا، اور حضرت فرما رہے ہیں کہ فی الحال تو آزادی کی جنگ —— یعنی اپنی قبر آپ کھودنے —— میں آنکھیں بند کر کے شریک ہو جاؤ، پھر آزادی حاصل ہو جانیکے بعد —— یعنی قبر میں مدفون ہو جانیکے بعد —— اُٹھ کر اپنی قومی زندگی (حیات بعد الموت!) کی حفاظت کر لینا۔

کہا جاتا ہے کہ قومیت کے مفروضے، اور جمہوریت کے اصولوں، اور پارٹی سسٹم پر جو نظام حکومت بن رہا ہے، اُس میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کیلیے کراچی کے بنیادی حقوق بالکل کافی ہیں۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کا ماخذ ۱۶۸۹ء کا اعلانِ حقوق اہل انگلستان ہے۔ اس کے بعد اسی قسم کے اعلاناتِ حقوق مختلف مغربی اور خصوصاً امریکی دستوروں میں شامل کیے جا چکے ہیں۔ مگر اس قسم کے اعلانات کبھی کسی ایسی جماعت کے حقوق کا تحفظ نہ کر سکے جسے تہذیب، یا مذہب، یا نسل ورنگ نے اپنے ہم وطنوں کی اکثریت سے جدا کر رکھا ہو۔ انگلستان میں اس اعلان کے باوجود ڈیڑھ سو

برس تک کیتھولک فرقہ پر سخت مظالم ہوتے رہے۔ ۱۷۷۸ء میں ان کی اصلاح حال کیلیے ایک تجویز پیش ہوئی مگر نصف صدی تک کوئی اسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ۱۸۰۵ء سے ۱۸۲۸ء تک انکے حق میں ۱۴ بل پیش ہوئے، اور ہر بار پارلیمنٹ نے ان کو رد کر دیا۔ آخر کار ۱۸۲۹ء میں ان کو پارلیمنٹ کی رکنیت اور سیاسی و نظمی ادارات کی شرکت کا حق ملا، مگر اس وقت جبکہ انکی جد و جہد خطرناک حدود تک پہنچ چکی تھی۔

ممالک متحدۂ امریکہ کے دستور اساسی میں بھی باشندگانِ ملک کے بنیادی حقوق کا صریح اعلان کیا گیا تھا، مگر قریب قریب ۷۵ سال تک امریکہ کے لاکھوں حبشی باشندے نہ صرف اِن حقوق سے بلکہ عام انسانی حقوق سے بھی محروم رہے۔ ۱۸۶۵ء کی خانہ جنگی کے بعد ان کو کسی حد تک انسانی حقوق حاصل ہو گئے، لیکن حقوق شہریت سے اب بھی وہ اسی طرح بے بہرہ ہیں، بلکہ آج اس بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں بھی ان کو زندہ جلا دینے اور جانوروں کی طرح ان کا شکار کرنے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، درانحالیکہ امریکہ کی مہذب سلطنت میں پولیس اور عدالت کا ایک مکمل نظام موجود ہے۔

یورپ کی ۲۷ ریاستوں میں ساڑھے تین کرور باشندے اسوقت اقلیتوں کی حیثیت سے رہتے ہیں اور قریب قریب ان تمام اقلیتوں کے بنیادی حقوق، مقدس تحریروں کی صورت میں لکھے ہوئے موجود ہیں، مگر اسکے باوجود اکثریت کی حکومت ہر جگہ ان پر اپنی زبان اور اپنے نظام تعلیم کو مسلط کر رہی ہے، اور ہر قسم کی تمدنی، معاشی اور سیاسی تکلیفیں ان پر ڈال رہی ہے تاکہ یا تو وہ اکثریت کی قومیت میں جذب ہو جائیں یا صفحۂ ہستی سے ناپید ہو جائیں۔

۱۹۱۹ء کے وائمار کانسٹی ٹیوشن (Weimar Constitution) کی رو سے جرمنی میں بھی تمام باشندگان ملک کے بنیادی حقوق محفوظ کیے جا چکے ہیں۔ مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ان کیلیے جرمنی کے حدود میں عزت کے ساتھ رد و ٹی کمانا قریب

قریب محال ہوگیا ہے، اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے انکے لیے بند ہیں۔ کوئی آزاد پیشہ بھی وہ آسانی کیساتھ نہیں کرسکتے۔ عدالتوں میں انکے ساتھ صریح نسلی امتیاز برتا جاتا ہے، اور انصاف کا نظریہ، یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ پیدائشی مجرم ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم ثابت نہ کردے۔ عام باشندے اگر ان کے ساتھ کوئی لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں تو اُن پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ ملک کے مدارس میں ان کے بچوں پر ناقابلِ برداشت پابندیاں ہیں، اور اگر وہ ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنیکے لیے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو مہاجر قرار دے دیا جاتا ہے تاکہ وہ پھر واپس نہ آسکیں۔ والدین اگر خود اپنے بچوں سے ملنے کے لیے جانا چاہتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے، اور ہجرت کرنے والے کیلیے یہ قانون بنایا جاچکا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس فی صدی جرمنی سے باہر لے جاسکتے ہیں، باقی سب کچھ ضبط۔

یہ اُن "قوموں" کا حال ہے جو "اوطان" سے بنی ہیں، اور ہمیں آج تک کسی ایک ملک کی مثال بھی ایسی نہیں ملی جہاں دستورِ اساسی کے بنیادی حقوق نے کسی اقلیت کو اپنے ہم وطنوں کی اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو۔ ہر جگہ ملک کی پوری آبادی کو ایک ہی قوم فرض کیا گیا ہے، اگر جہاں اقلیت اور اکثریت میں مذہب یا تہذیب یا نسل یا رنگ یا زبان کی بنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے، وہاں جب اکثریت کو حاکمِ مطلق بننے کا موقع ملا تو اس نے اعلانِ حقوق کے باوجود یہی کوشش کی کہ یا تو اقلیت کو شودر بنا کر رکھے، یا اس کے امتیازی وجود کو فنا کردے۔

ہماری قوم کے جو حضرات بنیادی حقوق کے اطمینان پر "جنگِ آزادی" میں شریک ہو رہے ہیں، ان میں سے ایک طبقہ (یعنی "قوم پرست" طبقہ) تو اپنے امتیازی وجود کو قربان کرنے پر بخوشی آمادہ ہے کہ دین جائے تو جائے، تن تو اچھی طرح پلے گا۔ اب باقی ماندہ حضرات ارشاد فرمائیں کہ وہ ان دونوں صورتوں

میں سے کس صورت کیلیے راضی ہیں؟

مزید توضیح کیلیے ذرا اُن بنیادی حقوق کا تجزیہ بھی کر دیکھیے جو کراچی کے ریزولیوشن میں بیان کیے گئے ہیں:۔

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے، بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کیلیے ہو جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں ——— قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو ہر وقت باطل کر سکتی ہے۔ جمہوریت کے انگریزی نظریہ کی بنا پر قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا، اور اکثریت ہی کی حکومت اس کو نافذ کریگی۔ لہذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض انکے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا۔

دوسری دفعہ میں ہر باشندۂ ہند کو ضمیر کی آزادی، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو ——— یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہمکو دے رکھی ہے، مگر اسکے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مُردہ ہو کر رہ گئی۔ جبکہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں، اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصول تہذیب سے قطعاً ناآشنا، اور بالکل مختلف قسم کے نظریاتِ تہذیب، اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں مذہبی آزادی حاصل ہونیکا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں زبردستی نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائیگا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اتارا جائیگا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ ہماری مسجدیں

توڑی نہیں جائینگی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائیگا تاکہ یہ مسجدیں ویران ہو کر خود بخود آثار قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں سے پولیس کے سپاہی زبردستی نقاب نہ نوچینگے بلکہ مدرسے کے معلم نہایت شفقت و رحمت کیساتھ انکے ذہن میں وہ معیار اخلاق پیوست کرینگے جسکی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رقاصہ بننا زیادہ پسند کرینگی۔ یہ آزادی محض ایک افیون ہے، تاکہ اسکی پینک میں ہم پڑے سوتے رہیں، اور ہمارے گرد و پیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں۔ اس آزادی کے پروانے کو لیکر جو مولوی صاحب پشاور سے مدراس تک ماس کانٹیکٹ کی تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ پروانہ آپ کو تو اتنی آزادی ضرور دیتا ہے کہ رات دن قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں، آپکی ڈاڑھی یقیناً زبردستی نہیں مونڈی جائیگی، نہ آپکی عبا ضبط کی جائیگی، نہ آپکی تسبیح چھینی جائیگی، نہ آپکی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائیگی، مگر اس امر کی وہ کوئی ضمانت نہیں دیتا کہ آپکی نسل سے دوسری پشت میں کوئی اودے شنکر اور تیسری پشت میں کوئی دیویکا رانی برآمد نہ ہوگی۔ ایسے پروانۂ آزادی کی ہمیں ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت مفعولانہ نہیں بلکہ فاعلانہ آزادی مانگتی ہے۔ ہم استقلالِ وطن اسلیے چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کر سکیں۔ اگر یہ نہیں تو ہمارے لیے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی۔

تیسری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائیگی ــــ حکومت کے روپے اور اسکی طاقت سے ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس دفعہ کے خلاف نہیں ہے۔ اگر نظام تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکلیہ خارج کر دیا گیا ہو، بلکہ اگر نظام تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مر جائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں۔ درحقیقت اس دفعہ کا مطلب یہ ہے ہی نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور انکی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائیگی، بلکہ اسکا مطلب صرف یہ ہے

کہ انکو زبردستی قتل نہ کیا جائیگا۔ باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا سے وہ خود سوکھ سوکھ کر مرجائیں، تو حکومت پر اسکی کوئی ذمہ داری نہیں، بلکہ یوپی کے وزیرِ تعلیم کی زبان سے ہم کو بتایا جاتا ہے کہ انکا سوکھ سوکھ کر مرجانا ہی مطلوب ہے، تا کہ انکی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا ققنس پیدا ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق بھی ہمکو انگریزی حکومت میں حاصل ہے۔ اس نے بھی ہم کو اردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا (بلکہ ورنیکلر اسکول قائم کیے) اور کوئی ایسا آرڈیننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں۔ لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی۔ اگر یہی حالت اُس حکومت میں بھی ہو جسکو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، تو ہمارے لیے ایسی "قومی حکومت" بعینہٖ غیر قومی حکومت ہوگی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اسلیے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اُس طرح غذا دے سکیں جسطرح آزاد قومیں دیا کرتی ہیں۔ ورنہ بطورِ خود اپنی قومی ضروریات کا انتظام کر لینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے۔ اسکے لیے ہمیں کسی جنگ آزادی کی ضرورت نہیں۔

چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز انکے درمیان نہ ہوگا ـــــ یہ نہایت عمدہ دفعہ ہے۔ لیکن مساوات کا تصور ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصہ برابر کرنیکا قانون پاس کردے اور اسکی مخالفت کرنیوالی اقلیت کا اُسیطرح مذاق اُڑائے جسطرح ابھی چند روز ہوئے مسٹر داس کے بل کی مخالفت کرنیوالوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اڑایا جا چکا ہے، تو یہ دفعہ ہمارے کسی کام نہ آئیگی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندۂ ملک پر اسکے مذہب یا جات پات، یا عقیدہ و مسلک، یا صنف کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کیجائیگی کہ وہ کسی سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کے کسی منصب یا کسی پیشے اور کاروبار میں داخل نہ ہو سکے ـــــ اس دفعہ کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظامِ حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ کے عطا کردہ حقوق شریف مسلمان بہو بیٹیوں کو فلم ایکٹرس کے مرتبہ

عالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنوؤں اور مدرسوں وغیرہ سے استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے ـــــــ یہاں "بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو" کی قید نہیں لگائی گئی، جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رو سے گائے کی قربانی بند کی جاسکتی ہے، مگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجا کر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جن کے اعلان کو ایک نعمتِ عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے معاوضہ میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اوپر مسلط کرنے کے لیے جنگ کریں، جس کی پالیسی کی تشکیل، جس کے قوانین کی تشریع اور جس کے احکام کی تنفیذ میں ہم مفروضۂ قومیت، اور اصولِ جمہوریت اور پارٹی سسٹم کی بنیاد پر کسی طرح اپنا اثر استعمال نہیں کرسکتے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری خدمات اسلیے حاصل کی جارہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اسکے بیٹے کو تخت نشین کرادیں، رہا ہمارا اپنا حال، تو جو بنی اسرائیل کی سی پوزیشن ہمیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے، ابنِ فرعون کہتا ہے کہ وہی میرے عہد میں بھی حاصل رہیگی

(باقی)

مقالات

چوتھی صدی ہجری کا فقہی و مذہبی انقلاب

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ)

چوتھی صدی ہجری سے قبل کسی خاص امام کی تقلید کا خیال رائے عام کو متاثر نہ کر سکا تھا ابو طالب مکی قوت القلوب میں فرماتے ہیں:-

"لوگوں کی یہ تصانیف تو بعد کی چیزیں ہیں، پہلی اور دوسری صدی میں لوگوں کے اقوال حجت نہیں ہوا کرتے تھے اور نہ یہ قاعدہ تھا کہ خصوصیت کیساتھ کسی ایک ہی شخص کے مذہب پر فتویٰ دیا جائے، اُسی کی رایوں سے استدلال کیا جائے اور ہر مسئلہ و معاملہ میں اُسی کا قول تلاش اور بیان کیا جائے، حتیٰ کہ صرف اُسی کے مذہب پر تفقہ اور استنباط مسائل کی بنا رکھی جائے"

پھر تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں تخریج و استنباط مسائل کا کسی قدر رواج شروع ہوا لیکن، جیسا کہ تتبع سے معلوم ہوتا ہے، اس وقت بھی عام لوگوں میں تقلید شخصی کا شیوع نہ تھا اور نہ کسی ایک امام کے اقوال کی روایت و تدوین ان کا شیوہ تھا، بلکہ خواہ عوام ہوں یا خواص و علماء سب کے سب ان خیالات سے بہت دور تھے۔

عوام کا حال یہ تھا کہ وہ اجماعی اور اصولی مسائل میں، جو تمام ائمہ اور ارباب اجتہاد کے درمیان متفق علیہ تھے، براہ راست شارع علیہ السلام کی تقلید کرتے تھے۔ وضو، غسل، نماز

وزکوٰۃ وغیرہ کے طریقے یا تو اپنے بزرگوں سے سیکھ لیتے یا اپنے گاؤں اور شہر کے اصحاب درس وتدریس سے، اور اُسی پر عمل کرتے۔ اور اگر کوئی اہم معاملہ پیش آجاتا تو جس فقیہہ یا مفتی کو پاتے بلا لحاظ مذہب ومسلک اُس سے فتویٰ پوچھ لیتے۔

خواص اور علماء کا حال یہ تھا کہ ان میں جو ارباب روایت و اصحاب حدیث ہوتے، وہ ہر طرف سے نظریں ہٹا کر احادیث میں مشغول رہتے۔ اگر انہیں احادیث یا آثار صحابہ میں کوئی مشہور مستند چیز مل جاتی جس پر فقہائے سلف کا عمل بھی رہ چکا ہو تو وہ پیروی کیلیے اسکو کافی سمجھتے، اور لوگوں کے اقوال ومذاہب کی طرف التفات ہی نہ کرتے۔ لیکن اگر وہاں کوئی چیز نہ ملتی، تو پھر جمہور صحابہؓ وتابعینؒ کے مشہور اقوال کو دلیل راہ بناتے۔ اور کبھی ان مآخذ سے بھی انھیں کوئی تشفی بخش حل نہ ملتا، مثلاً نصوص باہم متعارض ہو جاتیں اور کوئی وجہ ترجیح اُن کے ذہن میں نہ آسکتی، تو ایسی حالت میں وہ فقہائے متقدمین کے اقوال کی طرف رجوع کرتے اور ان کی مختلف رایوں میں سے اس رائے کو اختیار کرتے جو اُن کے نزدیک کتاب وسنت کی روح سے زیادہ اقرب ہوتی اور جسکے حق میں دلائل زیادہ مضبوط ہوتے۔ وہ ماخذ اور دلیل کو دیکھتے تھے، قطع نظر اسکے کہ کونسا قول کس گروہ کا ہے۔

یہ طریقہ تو محدثین کا تھا۔ اصحاب تخریج کا قاعدہ یہ تھا کہ وہ جن مسائل کا حل نصوص شرعیہ میں صاف اور صریح نہ پاتے، انھیں تخریج واستنباط کی روشنی میں حل کرتے، اور اپنے اصول کے مطابق اجتہاد کرتے تھے۔ اور اس اجتہاد کے باوجود یہ لوگ اپنے اپنے ہم خیال ائمہؒ کبار کے مذہب سے منسوب کیے جاتے تھے، مثلاً کہا جاتا کہ فلاں شخص حنفی ہے اور فلاں شافعی ہے۔ یہی طریقہ محدثین کے بارے میں بھی برتا گیا۔ مذاہب مروجہ میں سے جس مذہب سے ان کا مسلک نسبتاً زیادہ قریب اور ہم آہنگ ہوتا آزادیٔ رائے اور عدم تقلید کے باوجود اُسی مذہب کی طرف انھیں منسوب کر دیا

جاتا، مثلاً نسائی اور بیہقی جو بجائے خود امام اور محدث تھے، "شافعی" کہے جانے لگے۔ غرض اُس زمانہ میں قضاء اور افتاء کی مسند پر وہی بیٹھتا تھا جو شان اجتہاد رکھتا ہو۔ جو مجتہد نہ ہوتا وہ فقیہ بھی نہ کہلاتا۔

اب وہ دور آتا ہے جس میں علوم شریعت پر ایک طرح کا اضمحلال طاری ہو جاتا ہے، مسلمان بکثرت اِدھر اُدھر پھیل جاتے ہیں اور ان کے علمی ذوق میں ایک تباہ کن انقلاب برپا ہوتا ہے۔ وہ ذہنی بیماریاں جنھوں نے انکی فکری و علمی صلاحیتوں کو شدید نقصان پہنچایا چند اقسام کی تھیں۔

(۱) پہلی بیماری جس نے ملت مرحومہ کے پیکر کو کھوکھلا بنانے میں سب سے نمایاں حصہ لیا وہ فقہ اور اسکی تفصیلات سے متعلق اہلِ علم کی باہمی نزاع اور ہنگامہ آرائی تھی۔ یہ افسوسناک داستان امام غزالیؒ نے تفصیل سے بیان کی ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے:-

"خلفائے راشدین کا میمون و مبارک دور جب ختم ہوگیا تو زمام خلافت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جو اس امانت کے اٹھانیکی مطلقاً صلاحیت نہ رکھتے تھے اور احکامِ شریعت سے قریب قریب نابلد تھے، اس لئے وہ مقدمات فیصل کرنے اور قضائے شرعی جاری کرنے کیلیے مجبور ہوئے کہ علماء دین کی صحبت سے استفادہ کریں، اور قدم قدم پر اُن سے رجوع کریں۔ گو خیر القرون کا دور ختم ہوچکا تھا، مگر پھر بھی حق پرست اور صحیح علم و بصیرت رکھنے والے علمائے سے دنیا بالکل خالی نہ تھی۔ خلفاء کو ایسے لوگوں کی تلاش رہتی مگر اُن کی بے نیازی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ حکومتیں انھیں جتنا اپنی طرف کھینچتیں، وہ ان سے اتنا ہی زیادہ کھنچتے جاتے۔ جاہ پسند لوگوں نے جب دیکھا کہ اس اِعراض اور استغنا کے باوجود وہ مرجع خلائق بنے ہوئے ہیں بڑے بڑے ائمہ دین ان پر ٹوٹے پڑتے ہیں اور انھیں

جو عزت وعظمت اور مقبولیت حاصل ہے، پادشاہِ وقت کیلیے بھی باعثِ صدرشک ہے تو ان کے دلوں میں اس ذریعۂ عزت یعنی علوم دین کے حاصل کرنیکا شوق پیدا ہوا تاکہ اسے بازار میں لاکر عزّ وشرف کا سودا کریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم دین کا ایوانِ عظمت جاہ پرستی کے سیلاب میں غرق ہوکر رہ گیا۔ اب علمار وفقہا ڈھونڈھے نہ جاتے تھے بلکہ وہ خود اپنے ڈھونڈھنے والوں کو ڈھونڈھتے پھرتے تھے۔ جو کچھ انکی عزت تھی سلاطین سے منہ موڑنے کی بدولت تھی۔ جب انہوں نے خود سلاطین کا رخ کیا تو عزت ذلت سے بدل گئی، الّا ما شار اللہ۔

"اس سے قبل کلامی جدلیات کی داغ بیل پڑ چکی تھی، علم کلام پر بعض کتابیں لکھی جاچکی تھیں، بحث ومناظرہ کے اصول وفروع بھی قائم ہو چکے تھے، اختلافی مسائل پر سوال وجواب کا رواج عام ہو چکا تھا، بالآخر ان فقہا کیلیے یہ چیزیں خاص توجہ اور دلچسپی کا مرکز بن گئیں کیونکہ درباروں میں اس کے بغیر بار نہ حاصل ہوتا۔ بعض خلفار فقہی مناظروں کے بڑے دلدادہ تھے، حنفی اور شافعی مباحثوں سے خصوصیت کے ساتھ انھیں دلچسپی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اربابِ فن، کلام اور دیگر علوم کے میدانِ تحقیق وجستجو سے نکل کر اختلافی مسائل فقہیہ کے معرکہ زار میں اُتر آئے اور حنفیت اور شافعیت کے اکھاڑوں میں باہم نبرد آزمائی ہونے لگی کہ خداوندان جاہ وثروت کی توجہ حاصل کرنے کا یہی مجرب ترین نسخہ تھا۔

"ستم یہ کہ وہ اپنی اس قیل وقال کو علم دین کی بڑی خدمت شمار کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ وہ اس طرح شریعت کے اسرار ودقائق کا استنباط کررہے ہیں ہر مذہب کے علل ومصالح بیان کررہے ہیں، اور اصول فتویٰ کی

راہ کھول رہے ہیں۔ اس خیال کے ماتحت انہوں نے تصنیفات اور استنباطات کا ڈھیر لگا دیا اور بحث و جدال کے گوناگوں اسلحہ ایجاد کر ڈالے۔ افسوس کہ وہ اب تک اسی روش پر چلے جا رہے ہیں۔ نہیں معلوم مستقبل انھیں کس راہ پر چلائے گا۔"

(۲) دوسری خاص بات اس زمانہ میں یہ پیدا ہوئی کہ تقلید جامد پر لوگوں نے قناعت کر کے تحقیق و اجتہاد کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ تقلید پرستی غیر شعوری طور پر ان کے ایک ایک رگ و ریشے میں سرایت کر گئی۔ اس کے چند اسباب تھے:۔

پہلا سبب فقہاء کی باہمی جنگ و جدل ہے کیونکہ جب ان میں آپس کی مناظرانہ چپقلش اور مزاحمت شروع ہوئی تو نوبت یہ آگئی کہ جہاں کسی فقیہ نے فتویٰ دیا، دوسرا فوراً اسکی تردید کر دیتا اور اپنی الگ رائے پیش کرتا۔ اس نزاع میں جب تک کسی قدیم امام یا مجتہد کا قول حکم نہ بنتا، جھگڑے کا تصفیہ ہی نہ ہو سکتا تھا۔ اس طرح ارباب علم و افتاء کیلیے ناگزیر ہو گیا کہ کسی نہ کسی امام کی تقلید محض کے حصار میں پناہ لیں۔

دوسرا سبب قضاۃ وقت کا ظلم و جور ہے۔ ان کے فیصلے اکثر سنتہ عادلہ سے بے پروا ہو کر جور و ستم پر مبنی ہوا کرتے۔ اس وجہ سے لوگوں کی نگاہ میں انکی رائیں مشکوک رہا کرتیں اور انھیں اس وقت تک تسلیم نہ کیا جاتا جبتک وہ سلف میں سے کسی امام کی رائے کا حوالہ نہ دیتے۔

تیسرا سبب جہل کا شیوع ہے۔ اکثر مفتیوں کا حال یہ تھا کہ نہ وہ علم حدیث سے کوئی بہرہ رکھتے تھے اور نہ تخریج و استنباط کی اہلیت رکھتے تھے، جیسا کہ تم اکثر متاخرین کے اندر یہ صفت بآسانی دیکھ سکتے ہو۔ علامہ ابن ہمام وغیرہ نے ا [redacted] و فقہی زوال پر شدید احتجاج کیا ہے۔ ایک وقت وہ تھا جب فقیہ اور مجتہد کے الفاظ ایک ہی معنی میں بولے اور سمجھے جاتے تھے

مگر اب فقاہت کا معیار بدل چکا تھا۔ اب غیر مجتہد بھی فقیہ ہونے لگا۔

(۳) اس دور میں ایک اور چیز پیدا ہوگئی جس نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی وہ علوم شریعت کے اصل سرچشمہ سے اک گونہ بے پروا ہوتے گئے اور زیادہ تر جزوی فنون میں داد تعمق دینے لگے۔ بعض نے بزعم خود علم الرجال اور فن جرح و تعدیل کی بنا ڈالی، پھر جدید و قدیم تاریخ کی تدوین میں منہمک ہو گئے۔ کچھ لوگ غریب و نادر احادیث و اخبار کی چھان بین میں معروف ہو گئے خواہ وہ سر تا پا افسانہ ہی کیوں نہ ہوتیں۔ ایک گروہ نے اصول فقہ کے دامن کو پھیلانا شروع کیا اور ہر صاحب نظر نے اپنے امام و اصحاب کے مسلک کی تائید میں بیشمار جدلی قواعد و ضوابط مدون کر ڈالے۔ رد و ایراد کے چرچے بہت بڑھ گئے، میدان مبارزت میں بے پناہ گرمی پیدا ہو گئی اور اس فن پر ہر ایک نے اپنے مسلک اور مذاق کے مطابق طویل و مختصر تصانیف کا انبار لگا دیا۔ ایک اور جماعت اٹھی جس نے بغیر کسی احساس ضرورت کے محض فرضی صورتوں کو سامنے رکھکر دماغی کاوش شروع کردی۔ یہ فرضی صورتیں جن پر وہ اپنی قیل و قال کی بنیاد رکھتے کبھی کبھی حد درجہ مستبعد اور بے اصل ہوا کرتی تھیں۔ اسی طرح کبھی کبھی مجتہدین سلف کے عموم عبارت اور اشارات کو لیکر خیال آرائی شروع کر دیتے جسکو ایک عامی انسان بھی سننا پسند نہیں کر سکتا۔

یہ دور اتنے فتنوں کو ساتھ لیکر آیا تھا۔ اختلاف و نزاع اور لا طائل تعمق و تدقیق کا یہ فتنہ تاریخ اسلام کے اس سیاسی فتنہ سے کسی طرح کم نہ تھا جس نے شیرازۂ ملت پر اپنی تیز مقراض چلا کر اس کا سارا انتظام ہی درہم برہم کر ڈالا۔ پہلا فتنہ خلافت اور حکومت کی طلب کا اٹھایا ہوا تھا ہر شخص نے اپنی جماعت یا اپنے جماعتی سرگروہ کو بر سر تخت لانے کی جا و بیجا سر توڑ کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ "ملک عضوض" (جابر و ظالم بادشاہ) امت کے سر پر مسلط ہو گئے۔ اور تاریخ اسلام

میں ایسے ہولناک واقعات پیش آئے جنکا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح یہ جدید فتنہ بھی قریب قریب ویسے ہی اسباب کے ماتحت آیا اور لوگوں کے دماغوں میں جہل اور شکوک اوہام کے گہرے نقوش چھوڑ گیا۔

زمانہ گذرتا رہا اور اسی اندھی، متعصبانہ تقلید پرستی پر نسلیں ختم ہوتی گئیں جسکی رو سے حق و باطل کی تمیز کرنا اور جدلِ محض اور استنباطِ صحیح کے حدود الگ کرنا بدترین گناہ ہے۔ اب فقیہ تمام ہونے لگا اس شخص کا جسکی زبان بحث و جدال کے میدان میں تیز تر ہو۔ جو کسی بات پر چپ رہنا جانتا ہی نہ ہو۔ جس نے بلا امتیازِ رطب و یابس، فقہا کے تمام اقوال رٹ رکھے ہوں اور ان کی دھواں دھار تلاوت کر سکتا ہو۔ یہی حال اصطلاحی محدّث کا تھا جو یہ سمجھے بیٹھا ہوا تھا کہ غلط، صحیح، موضوع اور مستند، ہر قسم کی روایتوں کو گن گن کر الگ کر لینا اور بغیر کسی معقولیت اور فہم و بصیرت کے انہیں بیان کر دینا حدیث دانی کا سب سے بڑا کمال ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہی حال سب کا تھا۔ نہیں، اس قحط کے باوجود اللہ کے کچھ بندے سلف کی یاد تازہ کرنیوالے بھی باقی تھے۔ اگرچہ بہت کم تھے مگر اللہ کی تائید ان کے شریکِ حال تھی۔ یہی لوگ ارض الٰہی پر اس کی حجت ہیں۔

اس دور کے بعد جتنا وقت گذرتا گیا فتنہ آرائی اور متعصبانہ تقلید پرستی کا طوفان بڑھتا ہی گیا اور دلوں سے علم و بصیرت کی خداوندی امانتیں نکلتی گئیں، حتیٰ کہ آج کے علمار کرام امورِ دین میں غور و تدبر کی "بدعت" کو مٹا کر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ اِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (ہم نے اپنے آبار کو ایک روش پر پایا ہے اور ہم انھیں کے نقوشِ قدم کی پیروی کرینگے) اب سوائے اللہ کے اور کس سے اسکا گلہ کیا جائے۔ وہی ہمارے حال پر رحم کرے۔

(ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

معرکۂ اسلام و جاہلیت

بدءالاسلام غریبا وسیعود غریبا

(۲)

(از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی)

حق و باطل کی فطری آویزش کا یہی وہ فلسفہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

بَدَءَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَّ سَیَعُوْدُ کَمَا بَدَءَ فَطُوْبیٰ لِلْغُرَبَاءِ (مسلم)

اسلام کا آغاز اس طرح ہوا کہ وہ "غریب" تھا اور پھر ایک وقت آئیگا کہ وہ پہلے کی طرح ہو جائیگا پس مبارکی ہو "غرباء" کیلیے۔

لفظ "غریب" کی تفسیر میں عجیب عجیب باتیں کہی گئی ہیں جن سے نہ تو کلام میں کوئی معنویت پیدا ہوتی ہے اور نہ ذوق ادب اسے تسلیم کر سکتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے فطری جزر و مد کا جو فلسفہ اس حدیث میں بیان ہوا ہے اکثر لوگوں کی نگاہیں اسکی تہ تک نہ پہنچ سکیں۔ اس لیے کسی نے "غریب" کی تشریح مفلس و نادار سے کی، اور کسی نے ادب و لغت کا کچھ لحاظ کیا تو اس کے معنی مسافر کے قرار دے دیے۔ حالانکہ یہ اور اس قسم کے تمام اقوال مضمون حدیث سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ یہاں غریب کے معنی ہیں اجنبی اور غیر مانوس کے۔ مسافر کو غریب اسی بنا پر کہتے ہیں کہ وہ ایک اجنبی اور بیگانہ ماحول میں ہوتا ہے، جہاں اسکی ذات و صفات سے لوگوں کو کوئی واقفیت اور انسیت نہیں ہوتی لیکن

اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ غریب بس مسافر ہی ہو سکتا ہے۔ اصل غرابت صورت و شکل اور وضع و قطع کی نہیں ہے بلکہ خیالات و نظریات، مذاق و مزاج اور عادات و خصائل کی ہے۔ ایک شخص اپنے احباب و اقارب میں ہوتے ہوئے بھی غریب سے غریب تر ہو سکتا ہے اگر اسکی طبیعت ان سے نہ ملتی ہو اور اسکے افکار و تصورات ان سے بالکل نرالے اور مختلف ہوں۔ پس اسلام کے "غریب" ہونے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ اسکی ابتدا بھی حالت مسافرت اور خانہ بدوشی میں ہوئی تھی اور انتہا بھی ہوگی۔ اور نہ اس فرمودۂ حکمت کا یہ مطلب ہے کہ دولت اور اسلام باہم اضداد ہیں، پہلے بھی یہ مفلسوں کا مذہب تھا اور آخر میں بھی مفلسوں ہی کا مذہب ہوگا۔ بلکہ دراصل اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام جب آیا تو وہ اپنی خالص عقلیت، اپنی بے آمیز فطریت، اپنے تصورات کی رفعت اور اپنے اصولوں کی پاکیزگی کے اعتبار سے اُس دنیا کے لیے بالکل نرالا، بالکل اجنبی اور بیگانہ تھا جو نفس پرستوں اور رسمیات کے بندوں سے بھری ہوئی تھی۔ اسی طرح پھر ایک دور ایسا آنے والا ہے جب دنیا اسی طرح جاہلیت میں مبتلا ہوگی اور اسلام اس میں ویسا ہی اجنبی اور بیگانہ ہو جائیگا۔ اس کا نظام تہذیب، اسکے قوانین معاشرت، اس کے اصول سیاست سب کے سب دنیا کیلیے نامانوس اور ناقابلِ گرفت ہو جائینگے۔ لوگوں کے تنگ دماغ میں اس وسیع اور بلند نظامِ زندگی کا تخیل سماہی نہ سکیگا جسے اسلام پیش کرتا ہے۔ سارا عالم جاہلیت کی کی تیرگیوں میں گھرا ہوگا مگر اس چمکتی ہوئی کافوری شمع سے وحشت کھائیگا جسکی شعاعیں قرآن کے سینے سے پھوٹ رہی ہونگی۔ اس سے روشنی حاصل کرنا بے عقلی سمجھا جائیگا۔ اس سے روشنی حاصل کرنیوالوں کا مذاق اڑایا جائیگا، اور ان پر پھبتیاں کسی جائینگی۔ پس جاہلیت کے اس چھا جانیوالے سیلاب میں جس کا قدم جما رہا، جس نے اس "نامانوس" صدا کے درد سے اپنی زبان نہ روکی، جس نے اسلام کی اسپرٹ پوری طرح سمجھنے سمجھانے اور اسی پر عمل کرنے میں زندگی بسر کی، جس نے ہوا پرستی کے طوفانِ عام میں عقل کا سررشتہ نہ چھوڑا یعنی جو اپنوں میں رہکر بھی بیگانہ رہا، وہی "غریب" ہے اور اسی کیلیے مبارکی ہے۔

سرکار رسالتمآب کا یہ بیان کس قدر صحیح اور یہ پیشینگوئی کس قدر سچی ہے۔ پرانی جاہلیت میں بھی اسلام غریب تھا اور نئی جاہلیت میں بھی ہم دیکھ رہے ہیں کہ وہ پھر غریب نظر آرہا ہے۔

جب اسلام کی دعوت ابتدا میں ظاہر ہوئی تو صرف یہی نہ ہوا کہ توحید اور معاد اور وحی اور رسالت جیسے اعلیٰ و ارفع حقائق پر جاہلیت کے غلافوں میں لپٹی ہوئی عقلوں نے حیرت اور اچنبھے کا اظہار کیا ہو بلکہ عام دنیوی معاملات میں بھی جن احکام اور جن اصولوں کی حکمتیں بالکل واضح اور مصلحتیں بالکل نمایاں تھیں، دنیا والوں کی عقل نے انھیں بھی سمجھنے اور ماننے سے برملا انکار کردیا۔ بلکہ آگے بڑھکر اگر تم خود صحابۂ کرام کے حالات پر گہری نظر ڈالوگے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ اسلامی تصورات کی پاکیزگی اور بلندی کو پوری طرح سمجھنے اور اسے اپنے اندر جذب کرنے میں ایسی بے نفس اور حق آگاہ جماعت کو بھی کیا کیا دقتیں پیش آئیں۔ گاہے بگاہے پرانے غیر اسلامی جذبات و تخیلات کس طرح انکے ذہن پر ابھر آتے تھے اور رسول اللہ صلعم نے کتنی جانفشانیوں کے بعد انکے دلوں سے جاہلیت کا زنگ کھرچنے میں کامیابی حاصل کی؟

یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسکا مشاہدہ عقائد کے علاوہ اسلامی نظام کے ایک ایک شعبہ اور جزیئہ میں کیا جاسکتا ہے۔

خود اسلام کی ہیئت ترکیبی کو لیجیے جب اس نے انسانی حرکات و سکنات کے ایک ایک گوشہ میں تقویٰ اور پاکیزگی کا رنگ بھرنا چاہا، لوگوں کے تمام افکار و عواطف پر بندشیں لگانی شروع کیں اور اخلاق و معاملات کے اندر باطل کے منافذ ایک ایک کرکے بند کرنے شروع کیے تو کفار و منافقین اس کلیت اور ہمہ گیری کا مذاق اڑاتے تھے۔ مذہب کا جو جاہلی تصور ان کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا، اور چند لایعنی رسوم کو مذہب کا نام دیکر بطور ضمیمۂ زندگی اس سے واسطہ رکھنے کے جس طرح وہ عادی بن چکے تھے اسکے پیش نظر جب وہ دیکھتے کہ یہ مذہب آزادی و اباحت نفسانی کے تمام ناکوں پر اپنا نقیب اور داروغہ مقرر کررہا ہے، زندگی کے ایک ایک قدم پر جزا و سزا کا قانون سنا رہا ہے، اعمال و معاملات

کے تمام متفرق جزئیات کو چن چن کر ایک نظام زندگی کے شیرازہ میں باندھتا جارہا ہے، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہونا چاہتا ہے، اور زندگی ہی نہیں بلکہ موت اور موت کے بعد تک بھی انسان اس کے متعین حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا، تو اس انقلابی تصور مذہب سے جس کی تشکیل میں جاہلیت اور نفسانیت کو مطلقاً کوئی حق نہ دیا گیا تھا، وہ سخت نفرت اور اجنبیت محسوس کرتے، مسلمانوں کی بے عقلی پر ماتم کرتے، اور ان پر آوازے کستے۔ ایک منافق نے حضرت سلمان فارسیؓ سے از راہ طعن پوچھا کیوں جی سنا ہے کہ تمہارے پیغمبر ہر چھوٹی بڑی چیز میں مذہبیت پیدا کرتے ہیں حتیٰ کہ طہارت اور استنجاء کے اصول وآداب بھی بتاتے ہیں؟

گویا ان "روشن خیالوں" کے نزدیک وہ مذہب ہی نہیں جو ہر لمحہ انسانی اعمال و عقائد اور معاملات کی باگ اپنے ہاتھ میں لیے رہے۔

اسلام جس وقت آیا اس وقت "حکومت" کے متعلق ان لوگوں کی ذہنیت کا اندازہ کرو جو بادشاہت کو خواہشات نفسانی کا آلۂ کار سمجھتے تھے۔ جنکے یہاں حکومت کا استحقاق نسلی عصبیت اور آبائی وارثت کا رہین منت ہوا کرتا تھا۔ جو تخت خسروی پر بیٹھ کر اپنے ہی جیسے انسانوں سے سجدہ کرانا اپنا بنیادی حق سمجھتے تھے۔ جنکے سروں پر خدمتِ خلق کے بار امانت کی جگہ جاہ وشوکت اور کبر وغرور کا تاج رکھا جاتا تھا۔ پھر یہ دیکھو کہ اسلام نے نفسانی جذبات، حیوانی رجحانات اور کبر ونخوت کے جاہلی تخیلات سے مجرد کر کے خلافت کا جو ٹھیٹھ عقلی اور اخلاقی نظریہ قائم کیا اس پر انہوں نے کتنی حیرت اور اجنبیت کا مظاہرہ کیا۔ صرف اظہار حیرت ہی نہیں بلکہ اسے سفاہت اور بے عقلی پر محمول کیا؟ اسکی ایک ادنیٰ مثال تم ایرانی سردار کے دربار میں دیکھ سکتے ہو جہاں اسلامی سفیر — جسکے صفحۂ دل سے جاہلیت کے نقوش مٹائے جا چکے ہیں اور جو توحید کا سبق پڑھکر پتھر کے ساکت وصامت بتوں کی پوجا کے ساتھ ساتھ حکام اور سلاطین کے متحرک بتوں کی پوجا کی یاد بھی بھول چکا ہے — صلح وجنگ کے معاملات پر گفتگو کرنے جاتا ہے اور خودی وتمکنت کی

پوری شان کے ساتھ ، مکلّف قالینوں کو روندتا ، اپنے بھدّے نیزے کی اَنی ان میں گڑوتا ہوا تخت پر بادشاہ کے برابر جا بیٹھتا ہے - امرائے دربار اس بے باکی اور جسارت پر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ آخر یہ کس دربار اور مملکت کا آئین ہے کہ ایک معمولی سفیر حاکم وقت کو سجدہ کرنے کے بجائے اس مساویانہ شان کے ساتھ بادشاہ کے برابر جا بیٹھے - انسان پرست انسانوں سے دیکھا نہ گیا ، تیوریاں چڑھ گئیں - یہ رنگ دیکھکر توحید کا دیوانہ سفیر بھی حیرت زدہ رہ گیا ، اور یہ کہکر اٹھا اور چلا آیا کہ کیا تم اپنے ہی جیسے آدمیوں کی پرستش کرتے ہو ؟ کیا حکومت کا تخت بھی تمہارا مسجود ہے ؟ یہ پیشانی تو صرت ایک ہی تخت کے سامنے جھکنا جانتی ہے جسکا نام عرش الٰہی ہے - سفیر کی یہ "بے ادبی" ، " تہذیب و تمدن سے ناآشنائی" اور " مجنونانہ بددماغی" دیکھکر انہوں نے کہا یہ کیسا غیر معقول مذہب ہے جہاں شاہ و گدا میں کوئی تمیز نہیں جو تخت و تاج کا احترام کرنا بھی نہیں جانتا -

بیت المقدس کی فتح پر فاروقِ اعظم ---- وہ فاروقِ اعظم جنکا نام سنکر بڑے بڑے فراعنۂ وقت کے دل سینوں میں دہل جایا کرتے تھے ---- جب اس شان کیساتھ شہر میں داخل ہوتے ہیں کہ ان کا غلام اونٹ پر بیٹھا ہوا ہے ، وہ خود اونٹ کی مہار ہاتھ میں تھامے پیدل چل رہے ہیں اور پھٹے پرانے پیوند لگے ہوئے کپڑے جسم پر ہیں تو وہ عیسائی قوم جس نے بادشاہت کی قیصری شان دیکھی تھی اس عجیب منظر کو دیکھکر تصویر حیرت بن جاتی ہے - اسے یقین نہیں آتا کہ آیا خلیفہ اور بادشاہ کا جو خارجی مفہوم اس کی نگاہیں مشاہدہ کر رہی ہیں اسکا وجود بھی دنیا میں ہو سکتا ہے ؟

اسلامی نظریۂ خلافت کے سلسلے میں صلح و جنگ کی تعلیمات پر بھی ایک نگاہ ڈالو کہ انکے ساتھ جاہلیت نے کیا برتاؤ کیا ، اور اس "عزیب" نظریۂ جنگ کی بے لوثی و بے غرضی اور خالص للٰہیت کو سمجھنے اور قبول کرنے سے اس نے کتنی بیگانگی اور وحشت محسوس کی - اسلام نے جب لوگوں کو دعوت دی کہ آؤ حق کی حمایت کرو ، کفار کے بڑھتے ہوئے فتنوں کو دباؤ اور عدل کا بول بالا کرو ، تو جہل

و نفاق کے مریضوں نے سوال کیا، ہم یہ سب کچھ تو کرینگے مگر یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں ملیگا کیا؟ اس کا جو جواب دیا گیا وہ یہ تھا کہ کچھ ملنے کی خاطر جو لڑائی کی جائے وہ جاہلیت کی لڑائی ہے - اسلام کی لڑائی تمام ذاتی اغراض سے پاک ہے - اپنی ذات سے مال خرچ کرو، اپنی رسد خود لاؤ، اور اپنی جانیں قربان کرو، صرف اس لیے کہ خدا نے جو عدل اور نیکی کا قانون بھیجا ہے اسکی حکومت دنیا میں قائم ہو اور اس کے بندے اس قانون سے فائدہ اٹھائیں - اس خدمت کے معاوضہ میں اگر تم نے ایک اونٹ باندھنے کی رسّی کا بھی لالچ کیا تو تمہاری سب قربانیاں اکارت جائینگی - خدا کا دین تمہیں اس لیے لڑنے کی اجازت نہیں دیتا کہ مال و دولت کے خزانے اور دوسروں کو غلام بنانے کے اختیارات تمہیں حاصل ہو جائیں - ہم کفار سے اس لیے لڑنے نہیں جا رہے ہیں کہ ان سے ہمارا کوئی زر و زمین کا جھگڑا ہے یا کوئی ذاتی پرخاش ہے یا وطنی و نسلی عداوت ہے - ان اغراض کیلیے تلوار اٹھانا اور انسان کا خون بہانا تو قطعاً حرام ہے - یہاں بجز دفع فساد اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اور کچھ مقصود نہیں - جن سے ہم لڑنے جا رہے ہیں ان کی دشمنی نہیں بلکہ عین ان کی خیرخواہی ہمیں میدان جنگ میں لے جا رہی ہے - اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ہمارے بھائی ہیں - اگر قانون الٰہی کی اطاعت پر راضی ہو جائیں تب بھی ہمیں ان سے کوئی وجہ پرخاش نہیں - اگر وہ راہ خدا میں روڑے اٹکانے سے باز آجائیں تب بھی ہماری انکی دوستی ہو سکتی ہے -

جب پیغمبر علیہ السلام نے جہاد اسلامی کی یہ غرض و غایت بیان کی تو جاہل انسان حیرانی میں پڑگیا وہ صرف دو ہی قسم کی لڑائیوں سے واقف تھا - ایک وہ جو مال و دولت اور توسیع مملکت اور شہرت و ناموری کیلیے لڑی جائے - دوسری وہ جو فریق مقابل سے انتقام لینے کے لیے ہو - مگر ایسی لڑائی کا وہم و گمان بھی اس کے ذہن میں نہ تھا جو طمع اور انتقام دونوں کے جذبات سے خالی ہو، بلکہ محض فی سبیل اللہ ہو - اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر یہ کس قسم کی جنگ ہے؟ میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالوں اور معاوضہ میں کچھ بھی نہ چاہوں، حتیٰ کہ یہ بھی نہ چاہوں کہ لوگوں کو میری بہادری کا حال معلوم ہو اور وہ

میری تعریف کریں! میں حریف سے لڑنے جاؤں، نہ اس لیے کہ اس سے میری یا قوم و ملک کی عداوت ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ اسے سیدھا راستہ دکھانا مقصود ہے! جو شخص ابھی میرے بھائی کو قتل کرکے آیا ہے، اور ایک منٹ پہلے میری جان لینے کے درپے تھا، وہ محض کلمۂ شہادت پڑھ لے تو مجھ سے کہا جاتا ہے کہ اسے بھائی کی طرح گلے لگاؤں اور بھول جاؤں کہ وہ میرے بھائی کا قاتل اور خود میرے خون کا پیاسا تھا!

بدر کا معرکہ، جسے یوم الفرقان کہا گیا ہے، اسلامی تصور جہاد کی بلندی اور جاہلی تصور جنگ کی پستی کا بھی یوم الفرقان ہے۔ عقل و دیانت اور نفس و جاہلیت کے دواعی پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابل آجاتے ہیں اور ایک ہی ساعت میں اسلام کے انقلابی نظریات کا ایسا مظاہرہ ہوتا ہے کہ برسوں کی نشر و اشاعت میں بھی نہ ہوتا۔ مدعیان ایمان کی جماعت تین گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ ایک گروہ تو وہ ہے جو عقل و بصیرت کی نعمت سے اچھی طرح نواز جا چکا ہے، جس کے دل و دماغ میں نفس پرستی اور جاہلیت کو نفوذ کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ دوسرا گروہ متوسطین اور ضعفاء کا ہے جو اسلام کے عقلی نظریات کو ہضم کرنے سے ابھی تک قاصر ہیں۔ تیسرا گروہ عبداللہ ابن اُبی اور اسکے منافقین کا ہے جن پر جاہلی تصورات پوری طرح مسلط ہیں۔ ان تینوں جماعتوں کی حالتوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرو۔ پہلی جماعت تو وہی دیکھ رہی ہے جو قرآنی تعلیمات اور اصول کے اندر انکی شفاف عقل اور بے آمیز فطرت انھیں دکھا رہی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ اسلام ہتھیار اٹھانیکا مقصد کیا قرار دیتا ہے۔ اس کا سینہ قوم پرستی اور زر پرستی کے جذبات سے بالکل پاک ہے۔ اسے اس کا مطلق خیال نہیں کہ حریف اپنا ہی ہم قوم ہے اور ہمارے نیزے اپنے ہی دل و جگر کے ٹکڑوں پر پڑنے جا رہے ہیں۔ حتی کہ اسوقت انکے اندر اس قومی عصبیت اور حمیت کا بھی شائبہ تک موجود نہیں، جبکے لیے اپنے قبیلہ پر دوسرے قبیلہ والوں کو تلوار اٹھاتے دیکھنا بھی ناقابل برداشت تھا، کجا کہ دوسرے قبیلہ والوں کو خود ساتھ لیکر اپنے قبیلہ

والوں پر چڑھ جانا۔ جاہلیت کے پرانے جذبات اسلام کے عقلی و فطری نظریات کے سامنے اس طرح دب کر فنا ہو چکے ہیں کہ ایکطرف یہ جماعت اپنے خونی بھائی بندوں پر انصار کو حملہ کرنیکی اجازت اور ترغیب دے رہی ہے، دوسری طرف اپنی مادی کمزوری اور قلت سے ذرہ برابر بھی متاثر نہیں۔ اس نے یقین کر رکھا ہے کہ فتح و شکست کا مدار قلت و کثرت کے ماسوا کسی اور شے پر ہے جسکا نام توکل علی اللہ ہے۔ تیسری طرف میدانِ جنگ میں حصول غنائم کے بجائے صرف احقاق حق اور دفع باطل اسکے پیشِ نظر ہے، اور اسلامی روح جہاد اس طرح اسکی روح سے ہم آغوش ہو چکی ہے کہ وہ مال و زر سے لدے ہوئے قافلہ کو چھوڑ کر شمشیر و سنان سے مسلح فوج کے مقابلہ پر جانے کو ترجیح دیتی ہے حالانکہ یہ جماعت اُس ماحول کی تربیت یافتہ رہ چکی ہے جہاں اس حیرت انگیز انقلابی نظریہ کا خیال ہی پیدا ہونا سرے سے ناممکن تھا کہ لڑائی انتقام یا حصول غنائم کے ماسوا بھی کسی غرض کیلیے لڑی جا سکتی ہے، یا فتح کا انحصار مادی قوتوں کی فراہمی کے علاوہ بھی کسی شے پر ہے، یا باپ بیٹے بھی ایک دوسرے کے مقابل آ سکتے ہیں۔

دوسری جماعت خوف سے ہراساں ہو رہی ہے۔ وہ تیر و سناں کے مقابل میں توکل کی طاقت کا تصور کرنے کیلیے تیار نہیں ہے۔ اس پر اس حقیقت کا انکشاف دشوار ہو رہا ہے کہ اللہ کی تائید غیبی ان مخلص مجاہدین کے کیونکر شامل حال ہوتی ہے جو اس کے حکم کے مطابق اپنی تمام مادی قوتوں کو جمع کر کے باطل کے مقابل میں لا کھڑا کرتے ہیں اور اس کے بعد صرف اللہ پر بھروسہ کر کے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس قصور نگاہ کے ساتھ وہ مقاصد جنگ کی اسلامی اسپرٹ کا بھی احاطہ نہ کر سکی قریش کے لشکر کی طرف منہ کرتے ہوئے تو اس پر نزع کی سی حالت طاری ہونے لگتی ہے لیکن نہتے تجارتی قافلہ پر پل پڑنے کیلیے وہ ہمہ تن تیار ہے اور نبی کو اسی کا مشورہ دے رہی ہے۔

تیسری جماعت نے حسب توقع نہ صرف جنگ میں عملاً شریک ہونے اور صبر و توکل کی طاقت کا اندازہ

لگانے میں اپنے عجز کا ثبوت دیا بلکہ اس نے اس عجیب و غریب حرکت کا مذاق بھی اڑایا، قافلہ کے سہل الحصول مال و متاع کو چھوڑ کر قوی تر دشمن سے لڑنے کیلیے جانے پر سخت حیرانی کا اظہار بھی کیا، مسلمانوں کی خود فریبی پر بزرگانہ ماتم بھی کیا اور جب دیکھا کہ ان کا ایمان اور توکل انھیں قریشی سیلاب کی ہیبت ناکیوں سے اس طرح بے خبر کیئے ہوئے ہے تو بول اٹھے ۔

غَرَّ هٰؤُلَاءِ دِيْنُهُمْ (انفال - ۷) ان کے دین نے انھیں دھوکے میں ڈال دیا ہے

اور اس کی وجہ بھی صاف ہے ، جنگ کا یہ تصور اور فتح و شکست کا یہ فلسفہ اُن کے ذہن میں کیونکر آسکتا تھا جن کے نزدیک قوت کا منتہا لات و عزی کے حقیر پتھروں تک اور اغراض جنگ کا بلند ترین تخیل حصول غنائم تک محدود تھا ؟ جاہلیت کے جو اسباق انھوں نے پڑھے تھے ان میں اس کا کوئی ذکر تو تھا نہیں کہ جو قوم محض اللہ کیلیے ، نظام عالم کی برہمی اور شورش کو امن و عدل سے بدل دینے کیلیے اور سرکش و بے راہرو انسانوں کو سارے نظام کائنات سے ہم آہنگ بنانے کیلیے میدان میں آتی ہے وہ تنہا نہیں ہوتی ، اس کی مدد کیلیے آسمان سے ملائکہ آتے ہیں بلکہ تمام عناصر عالم کی ہمدردی اور حمایت اسے حاصل ہوتی ہے کیونکہ وہ بھی اسی مشینری کے اجزا ہیں جسے یہ لوگ درست کرنے اٹھے ہیں۔

وطن پرستی اور قومیت کا غرور دونوں چیزیں جاہلیت کے اصول موضوعہ میں سے تھیں - اپنی نااہلی کے باوجود اپنے ملک پر حکومت کرنا ، اس میں عزت کی زندگی بسر کرنا ملک کے باشندوں کا پیدائشی حق تھا - اپنی صالحیت ، عدل پروری اور نیکوکاری کی بنا پر کسی جماعت کا بلا امتیاز قوم و وطن ، حقدار حکومت ہونا بالکل ایک اچھوتا اور ناقابلِ فہم تخیل تھا - لیکن جب خلافتِ الٰہی کی تجدید کا وقت آیا تو قومیت اور وطنیت کا بت توڑ کر اعلان کر دیا گیا کہ :

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ بے شک زمین کے وارث خدا کے صالح بندے ہیں ۔

استحقاق حکومت کی یہ نامانوس صدا کانوں میں پڑی تو قوم پرست منافقین کے سینوں میں آگ لگ گئی- قوم پرستوں کے سردار رئیس المنافقین عبداللہ ابن اُبی نے اس نئے آیڈیل کو ناکام بنانے کی پے بہ پے کوششیں کیں- وہ انصار اور مہاجرین کی اسلامی قومیت کو کسی طرح نہ سمجھ سکتا تھا- اس کی نگاہ میں یہ دو الگ قومیں تھیں، اور وہ ہجرت کے معاملہ کو اس نظر سے دیکھتا تھا کہ ایک غیر قوم کے لوگ باہر سے آکر مذہب کے نام سے اسکی قوم کو اپنے نفع کیلیے استعمال (exploit) کر رہے ہیں- اُسے انصار پر حیرت ہوتی تھی کہ یہ کیوں اپنی پرانی قومیت کے تخیل کو بھول کر نئی قومیت کا "دو چکہ" کھا رہے ہیں- وہ، اور اسکے ہم خیال منافقین، جو سب کے سب انساب و اوطان کو بنائے قومیت سمجھتے تھے، ہر وقت اس فکر میں رہتے تھے کہ انصار میں قدیم جاہلیت کے جذبات کو تازہ کریں، اور مہاجرین سے ان کو الگ کرنیکا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں- مدینہ میں اسلام اور جاہلیت کے درمیان یہ ایک مستقل کشمکش تھی جو کئی سال تک جاری رہی- ایک طرف اسلام پوری طاقت کے ساتھ دماغوں میں اس انقلابی نظریہ کو اتار رہا تھا جسکی رو سے انسانیت کی تقسیم بجز کفر و دین کے اور کسی بنیاد پر نہیں ہو سکتی اور دوسری طرف جاہلیت ایک ایک قدم پر اسکی راہ روکتی اور اپنے پرانے نظریۂ قومیت کو سامنے لاتی تھی-

غزوۂ بنی المصطلق میں کسی چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر (جہجاہ ابن مسعود) نے ایک انصاری (سنان الجہنیؓ) کو طمانچہ مار دیا، انصاری نے قدیم دستور کے مطابق یا للانصار! کا نعرہ لگایا، مہاجر نے بھی مہاجرین کی دہائی دی، چشم زدن میں تلواریں بے نیام ہو گئیں- اگرچہ فوراً ہی اسلامی اخوت نے آکر جاہلیت کی اس چنگاری کو بجھا دیا- لیکن عبداللہ بن ابی کے دل کی آگ بھڑک اٹھی- اس نے اوس و خزرج کے پرانے نظریات اور قومی جذبات کو ابھارتے ہوئے کہا:

سمن کلبک یا کلک (ناداللہ　　اپنے کتے کو خوب موٹا کرو تاکہ وہ تمہیں پھاڑ کھائے

لئن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منھا الاذل۔ خدا کی قسم اگر ہم مدینہ لوٹے تو عزت رکھنے والا (یعنی خود) ذلیل کو (سرکارِ عالم اور مہاجرین) نکال باہر کریگا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اے انصار تم نے اس سانپ کو خود آستینوں میں پالا ہے، نتیجہ دیکھتے ہو کہ وہ تمہارے منہ آ رہے ہیں، تمہاری پناہ میں رہکر اور تمہاری روٹیاں کھا کر اب تمہارے ہی اوپر اپنا اقتدار جمانا چاہتے ہیں۔ یہ کتنی عجیب اور ہمارے لیے رسوا کن بات ہے کہ ایک بیرونی قوم ہماری قومی عزت اور خودداری کو ڈھا دینے اور اس پر اپنی فرمانروائی کا تخت بچھانے کا حوصلہ کر رہی ہے، اور حکومت و خلافت کا یہ پُر فریب نظریہ پیش کر رہی ہے کہ اللہ کی زمین محض اُس کے صالح بندوں کی وراثت ہے، اس پر حکومت کرنا انھیں کا حق ہے اور قومیت و وطنیت کے سارے فطری حقوق بے معنی ہیں!

مساوات کا مقام انسانیت کے بنیادی حقوق میں جس قدر بدیہی اور نمایاں ہے، دنیا اسی قدر اسے فراموش کر چکی تھی۔ اہل عرب کا دستور تھا کہ اگر کسی معمولی قبیلہ کا کوئی فرد کسی دوسرے معزز قبیلہ کے کسی فرد یا کسی بڑے سردار کو قتل کر ڈالتا تھا تو اسکے قصاص میں قاتل کیساتھ ساتھ اس کے خاندان کے متعدد بے گناہ اشخاص بھی قتل کیے جاتے تھے، یعنی ایک صاحب جاہ و حشمت انسان کا خون معمولی انسان کے خون سے دس بیس گنی زیادہ قیمت رکھتا تھا۔ غربت و امارت کا یہی جاہلی امتیاز اہل کتاب کے اندر بھی قبولیت حاصل کر چکا تھا۔ ان کے تعزیرات شرعی کی یہ ایک متفق علیہ دفعہ تھی کہ اگر کوئی بڑی ناک رکھنے والا آدمی جرم زنا کا ارتکاب کرے تو اسے کوڑے مارنے کی سزا دیجائے اور اگر بدقسمتی سے زانی کوئی معمولی اور کم حیثیت انسان ہو تو اس پر حدِ رجم جاری کی جائے۔

اسلام نے جب حقیقت کے مٹے ہوئے نقوش ابھارنے شروع کیے تو قانون مساوات کو بھی از سرِ نو زندہ کیا، اور اسے اپنے نظامِ سیاست کا سنگِ بنیاد قرار دیکر اعلان کر دیا کہ قانون الٰہی کی نگاہ میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ سب کے حقوق کی حرمت یکساں ہے، حتی کہ اگر خود نبی کی بیٹی اور اس کی

نورِعین چوری کرے تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ لیے جائینگے۔ لیکن جاہ پرست دنیا اس ہتک کو برداشت نہ کرسکی۔ خلیفہ دوم کے عہد میں ایک نومسلم رئیس (جبلہ بن ایہم غسانی) حج کیلیے آیا۔ اثنائے طواف میں کسی معمولی انسان سے دھکا لگ گیا۔ اسکی رئیسانہ تمکنت اس گستاخی کو گوارا نہ کرسکی اور اس نے فوراً ایک طمانچہ رسید کردیا۔ معاملہ کورٹ میں پہنچا۔ عدل فاروقی نے فیصلہ دیا کہ مظلوم اپنے ظالم کے چہرہ پر اتنی ہی شدت کا طمانچہ مارے۔ وہ رئیس حیرت سے منہ تکتا رہ گیا۔ آخر یہ حیرت ارتداد تک پہنچی۔ اس نے کہا مجھے تو اس اندھیر کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔ جس مذہب کے قانون میں شریف و رذیل کا کوئی امتیاز نہ ہو اس پر ایمان لانا عقل وضمیر کی توہین ہے۔

جاہلیت کی سوسائٹی مختلف طبقات میں بٹی ہوئی تھی جس میں شریف و وضیع، امیر و غریب، عالی نسب و کم نسب کے بہت سے مراتب تھے، اور ان مراتب میں سب سے نیچا درجہ غلاموں کا تھا۔ اسلام نے سرے سے طبقات کی اس تقسیم ہی کو قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ سب انسان مساوی الاصل ہیں اور ان میں بجز تقویٰ کے اور کوئی معیار بزرگی و خوردی نہیں۔ یہ انقلابی نظریۂ مساوات ذوق جاہلیت پر سخت گراں گذرا، کیونکہ تفاخر ہی تو نفس حیوانی کی رگ جان ہے۔ اسلام نے جب اس پر نشتر چلایا تو جاہلیت بلبلا اٹھی سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن، سردار قریش عبدالمطلب کی نواسی، اور عرب کے سب سے اونچے خاندان کی بیٹی زینب بنت جحش کی شادی ایک ایسے شخص سے کردی جو طبقات کی جاہلی تقسیم میں سب سے نیچے درجے پر تھا، یعنی آزاد کردہ غلام (حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ)۔ جاہلیت اس شدید انقلابی حرکت پر اس قدر چراغ پا ہوئی کہ بغاوت پر آمادہ ہوگئی۔ مدینہ کے منافقین ڈر گئے کہ یہ وبا کہیں ہماری سوسائیٹی میں نہ پھیل جائے۔ انکی عورتوں نے اسکے خلاف چرچے شروع کیے۔ خود حضرت زینب کو ورغلانا اور عار دلانا شروع کیا اور جاہلی جذبات کو بھڑکا کر انھیں اتنا برانگیختہ کیا کہ آخرکار زوجین میں منافرت پیدا ہوگئی، اور طلاق ہی نے اس قضیہ کو طے کیا۔

غلام کی طرح قیدی بھی انسانی مراعات کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن بدر کے قیدیوں کو جب صحابۂ کرام نے حسب ارشاد نبوی روٹی کھلائی اور خود کھجوروں پر اکتفا کرنے لگے، تو قریش کے اسیرانِ جنگ مارے شرم کے گردنیں، جھکا لیتے اور حالت حیرانی میں اپنے دلوں سے پوچھتے کیا اس آسمان کے نیچے قیدی کے ساتھ یہ برتاؤ بھی ہوتا ہے؟

عرب کا معاشرتی نظام رسوم جاہلیت کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کھانے پینے میں، نشست و برخاست میں، نکاح و طلاق میں، من گھڑت قیود مذہبی اصول کی حیثیت سے داخل تھیں، اور ان کا توڑنا سوسائٹی کی نگاہ میں بدترین گناہ تھا۔ ان رسمی تصورات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تبنّیٰ اصل بیٹے کا حکم رکھتا ہے اور اسکی بیوہ یا مطلّقہ بیوی سے شادی کرنا اسی طرح ناجائز ہے جس طرح اصل بیٹے کی بیوی سے۔ حضرت زینب کو جیسا کہ اوپر گذر چکا ایک غلام سے رشتہ ازدواج، منافق عورتوں کے طعن و تشنیع اور آخر میں مطلّقہ ہو جانیکے جو پیہم صدمات پہنچے تھے انکا مداوا صرف ایک طریقہ سے ممکن تھا، وہ یہ کہ انہیں ام المومنین کا درجہ عطا کیا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ خواہش دل میں رکھتے تھے لیکن سوسائٹی کی جاہلانہ ذہنیت سنگِ گراں بنکر راستے میں حائل تھی۔ قرآن نے حکم دیا کہ اس جاہلانہ تصور پر بھی ایک کاری ضرب لگاؤ، اور اس رسم پرستوں کی کچھ پرواہ نہ کرو۔

وَتُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ (احزاب)	تم اپنے دل میں وہ بات چھپا رہے ہو جسے اللہ ظاہر کرنے والا ہے۔ تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ اللہ اس امر کا زیادہ حقدار ہے کہ تم اس سے ڈرو۔

آخر کار جب خدا کے حکم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب سے نکاح کر لیا تو منافقین میں پھر وہی شور برپا ہوا جو پہلے حضرت زیدؓ سے نکاح کرنے پر ہوا تھا۔ انہوں نے ایک قدیم سنت

کی خلاف ورزی پر مطاعن کی بوچھاڑ کردی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی بہو سے بھی نکاح کرنے میں تامل نہیں کرتے - لیکن پیغمبر آخر الزماں کی بعثت تو اس غرض کیلیے تھی ہی کہ وہ خود ساختہ رسوم وقیود کے تار وپود بکھیر کر رکھ دیں - رحمتہ للعالمین کا منصب یہ بھی تو تھا کہ انسان کو ان زنجیروں سے نجات دلائیں جو اس نے اپنی نا سمجھی سے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی تھیں اور وہ بوجھ اسکے سر سے اتاریں جنہیں اس نے خود اپنے اوپر لاد اتھا اور خود ہی ان کے نیچے پس رہا تھا - لہذا منافقین کے اس تمام شور وغوغا کے باوجود حق کی تلوار نے بے نیام ہو کر اس قید بیجا کو کاٹ ڈالا -

جو قوم حقائق کو چھوڑ کر ظواہر پر اپنا نظام عمل مرتب کرتی ہے جنکی تہ میں نیکی اور تقوی کے عناصر موجود نہیں ہوتے اس پر کسی رسم یا قدیم رواج کی مخالفت نہایت شاق گذرتی ہے کیونکہ یہی رسوم تو اس کے دین ودنیا کی کل کائنات ہوتی ہیں - اس کی نگاہ میں ان ظاہری بندشوں کی عظمت اصل دین کی عظمت سے زیادہ ہوتی ہے اور جب ظاہری پردوں کو چاک کرکے اصل روح اور مقصد کی طرف انکی رہنمائی کیجاتی ہے تو دفعتہً انکے رگ وپے میں نفرت اور جاہلی حمیت آتش سیال بن کر دوڑنے لگتی ہے - وہ اشکال اور مظاہر کی تبدیلی کو اصل مقصد اور حقیقت کی تبدیلی خیال کرکے مخالفت پر آمادہ ہوجاتی ہے - چنانچہ تشریع اسلامی کے دوران میں اس ذہنیت سے بھی اسلام کو سخت مقابلہ پیش آیا - جب تحویل قبلہ کا حکم آیا تو بہت سے منافق علانیہ مرتد ہوگئے - قرنوں سے بیت المقدس قبلہ چلا آرہا تھا اور اسلام نے بھی ابتداءً ایک مدت تک اس کو قبلہ بنایا تھا، اسلیے وہ جاہل یہ سمجھتے تھے کہ قبلیت ایک خاص سمت اور مقام سے قدرتی تعلق رکھتی ہے - اب جو قبلہ بدلا گیا تو انہوں نے کہا یہ کیا تماشہ ہے کہ خدا بیت المقدس سے نکل کر کعبہ میں آبیٹھا؟ کیا اب تک جتنی نمازیں اس طرف رخ کرکے پڑھی گئیں سب غیر اللہ کیلیے تھیں؟ قرآن نے تحویل قبلہ کی حکمت بیان کرکے ان کے اس جاہلی تصور کو دور کرتے ہوئے جواب دیا کہ قبلہ کوئی مقصود بالذات شے نہیں - مشرق ومغرب سب خدا ہی کا ہے -

جس طرف تم رخ کرو وہیں خدا موجود ہے۔ کسی سمت خاص کو اس کی نگاہوں میں فضیلت اور محبوبیت حاصل نہیں، نہ کسی جہت میں وہ محصور ہے، اور نہ کسی قبلہ کی طرف رخ کرنا بجائے خود نیکی اور تقویٰ ہے بلکہ ثواب اور نیکی درحقیقت ایمان اور اعمال صالحہ کا نام ہے، لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ الخ۔ لیکن جاہلیت اور ظواہر پرستی کی ماری ہوئی عقل اس حقیقت کو حقیقت سمجھنے کیلیے کب تیار تھی۔ کتنے ہی مذبذب اور کتنے ہی مرتد ہو کر رہ گئے۔

اسلام نے جب آنکھیں کھولیں تو اس کے اردگرد معاشیات اور اقتصادیات کا ایک خالص ظالمانہ نظام قائم تھا جسکی پوری عمارت رہزنی اور سنگدلی پر کھڑی کی گئی تھی۔ غریب پر گویا رزق کے دروازے بند تھے۔ پیسہ ان کے ہاتھ میں آنیکا کوئی راستہ نہ پاتا تھا، مگر ہاتھ سے جانیکے بہتیرے راستے تھے۔ اس کے برعکس عیش پرست امرا کے ہاتھ میں وہ صرف آتا جاتا تھا نکلنے کی کوئی اختیاری راہ نہ پاتا تھا۔ اسلام اس دردانگیز منظر کی تاب کہاں سے لاتا۔ اس نے دولت مندوں کو کسب مال کے جائز حقوق دیتے ہوئے بقیہ تمام جارحانہ اور غیر عادلانہ طریقوں سے روک دیا۔ فقراء و مساکین کی معاشی فلاح کیلیے دو اصول متعین کیے۔ ایک تو فرضیت زکوٰۃ، دوسرا تحریم ربوا، کیونکہ ربوا وہ خونخوار درندہ ہے جو مفلس و ناتواں حاجت مندوں ہی پر جھپٹتا اور ان کا خون چوس کر انھیں موت کی آغوش میں ڈال دیتا ہے۔

صدقہ و زکوٰۃ کا فلسفہ اور مصرف شارع نے جب یہ بتایا:

تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِكُمْ وَتُرَدُّ عَلَىٰ فُقَرَائِكُمْ۔ یہ صدقہ تمہارے مالداروں سے لیکر تمہارے فقراء پر خرچ کر دیا جاتا ہے،

اور لوگوں کو اس پر ابھارا تو کفار و منافقین نے کہا:

قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَنْ لَوْ يَشَاءُ اللَّهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنْتُمْ (انفاق کا حکم سن کر کفر کرنیوالوں نے مومنوں سے کہا کیا ہم اس شخص کو کھلائیں جسکو اگر اللہ چاہتا

اِلَّا فِی ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ (یٰسین۔ رکوع ۴) تو کھلا دیتا۔ تم تو بالکل صریح گمراہی میں ہو۔

یعنی یہ صدقہ وزکوٰۃ کیا چیز ہے؟ اگر خدا ان ننگوں کو کپڑا اور بھوکوں کو کھانا دینا چاہتا تو اسے کون روک سکتا تھا۔ اس کی مشیت نے انھیں اس نعمت کا مستحق سمجھا ہی نہیں، پھر جسے اس نے بھوکا رکھا اسکو کھانا دینے کی جسارت ہم کیوں کریں، اور وہ ہم پر یہ فریضہ عائد کیسے کر سکتا ہے؟ یہ بات تو بڑی ہی عجیب ہوگی۔

سود کی ممانعت تو ان کے نزدیک سرے سے کسی توجہ کے قابل تھی ہی نہیں کیونکہ انھیں اس میں معقولیت کا کوئی پہلو نظر آتا ہی نہ تھا ان کا قول تھا کہ:

اِنَّمَا الْبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا (بقرہ۔ ۳۸) تجارت تو ربوا ہی کی طرح ہے۔

یعنی بجائے اس کے کہ سود کی اباحت کیلیے وہ اُسے بیع کے مماثل قرار دیتے اور بیع کی اباحت کو بطور اصل تسلیم کرتے ہوئے ربوٰ کے جواز کیلیے اُسے بیع کیساتھ تشبیہ دیتے، انہوں نے حلت ربوا ہی کو اصل قرار دیکر تجارت کو اس سے تشبیہ دی، گویا سودی منافع کی علت تو قطعی اور بحث وتمحیص سے بالکل بے نیاز ہے ہاں منافع تجارت کے جواز کو ثابت کرنے کیلیے اتنا کہنا پڑے گا کہ اسکی نوعیت بھی ربوا کی سی ہے جو مباح الاصل ہے، یہ تھا نفس حیوانی کا کرشمہ!

یہاں استقصار مقصود نہیں بلکہ مثالاً ان واقعات کی طویل فہرست کا ایک صفحہ پیش کردیا گیا ہے جو اسلام اور جاہلیت کی ابتدائی جنگ میں منظر عام پر آئے، اور یہ واقعات بھی محض قولی ہیں یعنی ان کے ذریعہ اسلام سے جاہلیت کی فطری اجنبیت اور وحشت کا افسانہ حقیقت ہم خود اسی کی زبان سے سُن رہے ہیں۔ ورنہ اگر جاہلیت کے عملی واقعات اور اس کے عام نظریات کو قلمبند کیا جائے اور ان سے اسلامی تعلیمات و اصلاحات کا موازنہ کیا جائے تو شاید دفتر کے دفتر بھی ناکافی ہونگے۔ پھر بھی جو معدودے چند واقعات اوپر کی سطروں میں بیان کیے گئے ہیں اتنے ہی تصویر کے اصلی خط وخال نمایاں کرنے

کیلیے کافی ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جاہلیت اور نفسانیت کی غلام دنیا نے قرآن کی فطری تعلیمات اور عقلی تصورات کے ہر ہر جزئیہ سے کتنی بیگانگی کا ثبوت دیا ہوگا اور اسلام کی "غریب" آواز سن کر حیرت اور استہزاء کے کتنے بلند قہقہے فضا میں گونج اٹھتے ہونگے، جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس بظاہر "اجنبی اور غیر مانوس" صدا پر جن پاک نفسوں اور سچی بصیرت رکھنے والوں نے ابتدا میں لبیک کہی وہ خود اجنبی اور قابل صد طعن و تشنیع بن گئے تھے:۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ ۔ (تطفیف - ۱)

مجرمین ایمان لانے والوں پر ہنستے تھے۔ وہ جب ان کے قریب سے گذرتے تو باہم (از راہ طعن و تمسخر) اشارے کرتے ہوئے، اور جب اپنے اہل و عیال کی طرف لوٹتے تو نشاط سے چہکتے ہوئے۔

گویا ان کا وجود ہی سراپا عجائب کدہ بن گیا تھا - پھر وہ وقت آیا کہ یہ اجنبیت ناقابلِ معافی جرم قرار دے دی گئی، زبانی چہچہے تلواروں کی جھنکاریں تبدیل ہو گئے اور جاہلیت نے اپنی حیرت کو غیظ و غضب سے بدل کر آہنی زنجیروں اور تیر و سناں کی نوکوں سے اس نامانوس آواز کو دباتا شروع کر دیا اگرچہ قدرت اس کے حوصلوں کے نامراد ہونے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

(باقی)

دارالاسلام کا ذہنی پس منظر

(از جناب عزیز ہندی)

[ہمارے رفقاء میں ایک تازہ، اور قیمتی اضافہ جناب عزیز ہندی کا ہے۔ ان کے نام سے ہندوستان کے اخبار بین حضرات ناآشنا نہیں ہیں۔ یہ ۱۹۲۰ء کی تحریک ہجرت کے علمبردار تھے۔ تقریباً دولاکھ آدمیوں کیساتھ ہجرت کر کے افغانستان تشریف لے گئے۔ وہاں جمال پاشا کے زیر سرپرستی انہوں نے فوجی تعلیم حاصل کی اور عساکر افغانیہ میں داخل ہو کر کرنل کے درجے تک ترقی کی۔ وہیں ان کو دنیائے اسلام کے آزاد ممالک کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنیکا موقع ملا جس نے روز بروز یہ حقیقت ان پر واضح کر دی کہ احیائے ملت اسلامیہ کیلیے ان آزاد ممالک کی فضا ہندوستان سے بھی زیادہ ناساز گار ہے۔ اسکے ساتھ انہوں نے کئی سال تک نظام اشتراکیت کا نہ صرف علمی حیثیت سے مطالعہ کیا بلکہ اسکے عملی پہلو کو بھی بہت قریب سے دیکھا اور اس مطالعہ نے آخر کار ان کو بربنائے اعتقاد نہیں، بلکہ علی وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچایا کہ نظام اسلامی کے مقابلہ میں نظام اشتراکی ہر حیثیت سے ناقص ہے، مگر دنیا اس ناقص نظام کی طرف صرف اسلیے کھنچی چلی جا رہی ہے کہ کامل نظام کو وہ مجاہد میسر نہ آئے جو ناقص نظام کو حاصل ہو گئے ہیں۔ یہی اثرات تھے جنہوں نے آخر کار ان کو افغانستان سے پھر ہندوستان کی طرف واپس بھیجا۔ یہاں یہ کئی سال تک احیائے ملتِ اسلامیہ کیلیے صدا بصحرا بلند کرتے رہے۔ اور اس دُھن میں انہوں نے اپنا سب کچھ

قربان کردیا۔ اب یہ مایوسی کے مقام تک پہنچ چکے تھے کہ دار الاسلام کی دعوت ان کو پہنچی، اور اس کو دیکھتے ہی ان کے ضمیر نے آواز دی کہ جس چیز کیلیے یہ برسوں سے سرگرداں تھے وہ یہی ہے]

ہندوستان کے اندر، ائمہ و مفکرین اسلام کا ایک ایسا گروہ موجود ہے جو "دین اسلام" کو محض چند عقائد و عبادات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ ایک مستقل نظامِ زندگی تصور کرتا ہے اور اسے اسی حیثیت سے آج کی دنیا میں متعارف کرنا چاہتا ہے۔

اس وقت دنیا میں جو نظام رائج ہیں ان کی تعداد صرف دو ہے۔ ایک کو "نظام سرمایہ داری" اور دوسرے کو "نظام اشتراکیت" کہتے ہیں۔ اور جس چیز کو ہم جمہوریت کے اسم ولقب سے موسوم کرتے ہیں وہ دراصل اپنی ذات میں کوئی نظام زندگی نہیں بلکہ صرف ایک "صورت سیاسی" (Political phase.) ہے جو زندگی کے ان دو بڑے نظاموں سے متعلق ہے۔

عرفِ عام میں جن ممالک کو ہم جمہوری کہتے ہیں مثلاً انگلستان، فرانس، امریکہ وغیرہ ان سب میں جمہوریت کے مراتب اور اسکی تعبیرات مختلف ہیں۔ روس کا اشتراکی ملک جسکا نظامِ زندگی، بدیہی اور قطعی طور پر ان مذکورۂ بالا ممالک سے مختلف ہے، جمہوریت کو اسی طرح اپنا رہا ہے جس طرح دنیا کے اور جمہوری ممالک۔ بلکہ اگر دیکھا جائے تو اٹلی جو فاشزم کا علمبردار ہے اور جرمنی جو نازی ازم کو پھیلا رہا ہے، صریح ڈکٹیٹر شپ کی موجودگی میں اس بات کا دعوی کر رہے ہیں کہ ان کے ہاں جمہوریت کی جو شکل و صورت ہے وہ فرانس، انگلستان اور امریکہ کی جمہوریت سے صحیح اور کامل تر ہے۔ روس میں مزدور حکومت کے اولین انتخابات کے موقع پر اشتراکیت کے علمبرداروں نے جو تقریریں کی ہیں ان میں صاف طور پر اس دعوے کا اعلان کیا گیا ہے کہ دنیا میں صرف اشتراکی نظام ہی ایک ایسا نظام ہے جس میں جمہوریت اپنی تمام منفعتوں کے ساتھ ظاہر و نمایاں ہو سکتی ہے۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ "جمہوریت"

بجائے خود کوئی نظام نہیں بلکہ یہ کسی نظام کی ایک متعلقہ صورت ہے جسے ہم نے اوپر "صورت سیاسی" کہہ کر پکارا ہے۔

دنیا نے اس وقت تک جسقدر ترقی کی ہے، وہ حیات انسانی کیلیے ان دو نظاموں کے سوا کوئی تیسرا نظام زندگی پیدا نہیں کر سکی۔ اور آج اگر دنیا کے اندر بسنے والے انسانوں کا تجزیہ کیا جائے تو خواہ ان کی نظری و فکری کیفیت آپس میں کتنی بعید و مختلف کیوں نہ ہو، وہ اپنی مذکورہ بالا دو نظاموں میں سے کسی ایک کے ماتحت اپنی زندگی بسر کر رہے ہونگے۔ یا وہ اشتراکیت یا اشتراکیت سے قریب تر کوئی نظام اختیار کیے ہوئے ہونگے، یا پھر وہ سرمایہ دارانہ نظام کی کسی شق کے ماتحت اپنی زندگی کی صبح و شام ایک کر رہے ہونگے۔ کوئی تیسرا نظام نہ انہیں میسر ہوا اور نہ سنجیدگی کیساتھ اب تک انہوں نے اسکی تلاش ہی کی ہے۔

"اسلام" زندگی کا ایک الٰہی نظام تھا جسے مسلمانوں نے فکر و عمل کی غلط کاری سے ملوکیت میں تبدیل کر لیا اور پھر عرصۂ دراز تک اسی کی آغوشِ ظلمت میں وہ اپنی زندگی بسر کرتے رہے۔ ملوکیت دراصل جاگیر دارانہ نظامِ زندگی (Feudal System) کی ایک "صورتِ سیاسی" تھی جسے آخر کار بعد کے ارتقائی درجوں میں نظام سرمایہ داری اور اسکی صورت سیاسی یعنی جمہوریت میں تحلیل ہونا تھا اور گو مسلمانوں نے ملوکیت کا جامہ خوشی خوشی اپنے زیب تن کر رکھا تھا تاہم چونکہ وہ ان کے فکری پس منظر سے مطابقت نہ رکھتا تھا اس لیے جب یورپ میں نظام جاگیرداری ترقی کر کے نظام سرمایہ داری میں تبدیل ہوا تو وہ نہ تو اس تبدیلی کو سمجھ سکے اور نہ کورانہ وار اس کی تقلید ہی کر سکے۔ یہ بالکل غلط ہے کہ مسلمان جہالت یا کم عقلی کی بنا پر ایسا نہ کر سکے۔ نہیں، بلکہ ان کا اس تبدیلی کو نہ سمجھنا محض اس سبب سے تھا کہ ان کا فکری پس منظر یورپ والوں کی طرح ابھی تک روحانیت سے مادیت میں تبدیل نہ ہو سکا تھا مسلمانوں نے عملی طور پر ملوکیت کو تو اپنا رکھا تھا لیکن فکری طور پر وہ ابھی اپنی روح کو مادیت

کے رنگ میں رنگین نہ کر سکے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ اپنے مادی پس منظر کی بنا پر اپنی زندگی کے نظام میں آگے بڑھتا چلا گیا، اور مسلمان ملوکیت ہی کے ہلاک آفریں گرداب میں پھنسے رہے۔

فکر و عمل کے اس بعد و تناقض نے، یورپ والوں کے بالمقابل مسلمانوں کو کمزور کرنا شروع کیا اور دو ہی تین صدیوں کے قلیل عرصہ میں انہیں یورپ، ایشیا، اور افریقہ کے بہت سے ممالک سے بیدخل کر کے رکھدیا۔ پھر جس طرح ہر کمزور طاقتور کا اثر بہت جلدی قبول کرتا ہے، اسی طرح ان ممالک کے مسلمانوں نے جہاں انکی اپنی سلطنتیں قائم تھیں، بتدریج اپنے فکری پس منظر کو بدلنا شروع کر دیا حتی کہ آج ہم ترکی میں مصطفےٰ کمال، ایران میں رضا شاہ پہلوی، اور مصر، عرب، افغانستان وغیرہ میں اسی قسم کے امراء کو موجود دیکھتے ہیں، جو اپنے اس فکری پس منظر کو یورپ کے مادی پس منظر میں تبدیل کر چکے ہیں۔ اب ان کی زندگی کا نظام بھی سرمایہ دارانہ نظام زندگی کے مختلف مدارج میں سے گذر رہا ہے، اور وہ بھی اپنے داخل میں اس نظام کی "صورتِ سیاسی" یعنی جمہوریت کو متعارف و قبول کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اور جن ممالک میں مسلمان مغلوب و محکوم ہیں وہاں بھی اجنبی حاکموں کا غلبہ و اثر یہی کچھ منظر پیش کر رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمانوں کے آزاد ممالک میں، فکر و نظر کے اسلامی پس منظر کو قوت و تشدد کے زور سے دبانے کی کوششیں کی گئیں جیسے ترکی افغانستان اور ایران میں ہوا لیکن یہاں ہندوستان اور اسی کی طرح کے دیگر محکوم ممالک میں نظام سرمایہ داری کی عملی تعلیم و تلقین نے اس روحانی اور الٰہی پس منظر کی جگہ بتدریج مادی پس منظر کی بنیادیں تعمیر کرنا شروع کر دیں، اور آج نوبت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ ہمارے ہاں زندگی کا نظریہ ہی سرے سے تبدیل ہو چکا ہے۔ اب ہم اپنے معاملات زندگی کے بیشتر کاموں کو اور ہی زاویۂ نگاہ سے دیکھنے لگ گئے ہیں، مادیت کا گہرا رنگ ہم پر چڑھ چکا ہے اور ہم نظام سرمایہ داری کا ایک خوبصورت شکار بن چکے ہیں۔

ابتدائی انقلاب کے وقت مسلمانوں نے غلط طور پر "بادشاہت اور ملوکیت" کو "اسلامی خلافت" سمجھا۔ وہ ماسوا اللہی طاقت کے آگے جھک پڑے اور بت پرستوں کی طرح بادشاہت کے بت کو پوجنے لگ گئے۔ ساری ملت ان ہی کے رحم و کرم پر تھی۔ ان کی اس ذرا سی لغزشِ نگاہ نے ہمیں صدیوں پیچھے ڈال دیا اور انجام و نتائج کی تباہ کاریوں سے ہم ہمیشہ کیلیے غیر محفوظ ہو گئے۔

تاہم فکر و نظر کی یہ نہایت ہی نازک اور اہم غلطی، اپنے ارتکاب کے وقت بالکل غیر محسوس طور پر ہوئی کہ ملوکیت، خلافت کے لباس میں ملبس ہو کر سامنے آئی تھی اس لئے علماء وضاحت اور قطعیت کیساتھ اس کے برخلاف جہاد کا علم بلند نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کو جو خلیفہ کہلاتے تھے تنقید و گرفت سے تو نہ چھوڑا مگر بادشاہت کے اس لباس کی وہ پردہ دری نہ کر سکے جو ان خلفائے پہن رکھا تھا۔ غرضکہ اسلام کے صحیح تصور سے اس طرح اوجھل ہو کر ہم نے ملوکیت[1] کی جو بنیاد رکھی تھی اسے تاریخی اور سائنٹفک طور پر بھی بالآخر اسی منزل پر پہونچانا تھا جسکے سامنے ہم آج سب کے سب کھڑے ہیں۔

---

[1] ریاست یعنی اسٹیٹ (State.) کے متعلق اسلام کا بنیادی تخیل بادشاہت یا ملوکیت نہ تھا بلکہ خلافت و نیابت الٰہی تھا۔ صدر اسلام سے ہٹ کر سب سے پہلے خلفاء بنی امیہ نے ملوکیت کو اسلام میں راہ دی۔ انہوں نے "خلافت اور خلیفہ" کے ناموں کو تو بجنسہٖ برقرار رہنے دیا لیکن انکی روح کو ملوکیت میں بدل ڈالا۔ سب سے پہلی ضرب جو انہوں نے خلافت پر لگائی وہ خلافت میں نسلی وراثت کا رواج تھا، اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ "ملوکیت، خلافت کے لباس میں ملبس ہو کر سامنے آئی تھی اس لئے مسلمان وضاحت اور قطعیت کیساتھ اس کے برخلاف جہاد کا علم بلند نہ کر سکے" تو اسکا یہی مطلب ہے کہ وہ خلافت میں نسلی وراثت کے دور رس نتائج کو صاف طور پر نہ دیکھ سکے اور یہی انکی غلطی تھی۔ اس نے آگے چل کر اسلام کی روح اخلاق کو (جو خلافت کے صحیح تخیل کی صورت میں تو بعینہٖ برقرار رہ سکتی تھی) ملوکیت کے اخلاق میں بدلنا شروع کیا اور جب عباسیہ کے دور میں خلافت کی مملکت اپنی انتہائی وسعت کو پہونچ چکی تو اسی ملوکی اخلاق کی بنا پر مختلف اقطاع اسلامی اپنے مرکز سے جدا ہو ہو کر ٹھیٹھ ملوکیت کے لباس میں ظاہر ہونے شروع ہو گئے، اور ان اقطاع و ممالک میں سلطنت و بادشاہت کا وہ عجمی تخیل جس سے

اور گو آج ہم صریح خسران اور گھاٹے میں ہیں، تاہم خدا کا شکر ہے کہ ہم نے صدیوں پہلے جس غلطی کا ارتکاب نامعلوم و نامحسوس طور پر کیا تھا اسے ہم نے عین وقت پر یعنی اپنی ہلاکت و مرگ سے پہلے دریافت کر لیا ہے۔ اب بظاہر ہمیں کوئی خطرہ نہیں۔ ہماری نشأۃ ثانیہ یقینی و ناگزیر ہے، اور گو ہم تیقن کے ساتھ اس مدت کا اندازہ ابھی نہیں کر سکتے جو ہماری زندگی کی تجدید کے لیے ضروری ہے، تاہم اس امر کا خطرہ اب بالکل جاتا رہا ہے کہ ہم سرے سے محو و ہلاک ہو جائینگے۔

ہم جس غلطی کے مرتکب ہوئے تھے اسے صدیاں گذر چکی ہیں اور اب یقیناً، اسکی تلافی و

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۶۔ اسلام شروع میں معرکہ آرا رہا تھا از سر نو قائم ہو گیا۔

خلافت کو ملوکیت میں اس طرح مسخ و منقلب کر کے مسلمانوں نے جو راستہ اپنے لیے تجویز کیا وہ اُس حقیقی شاہراہ سے بالکل مختلف تھا جو اسلام نے ان کے لیے مشخص و متعین کر رکھا تھا۔ پس اس امتیاز کو مٹا دینے کے بعد ان کے لیے بجز اغیار کی تقلید کے اور کوئی چارۂ کار ہی باقی نہ تھا۔ میرا یہ دعوے ہے کہ اگر مسلمان، خلافت کے صحیح تصور کو اسطرح کھو نہ دیتے تو روم و فارس کی سلطنتوں کی تباہی کے بعد جو دراصل جاگیردارانہ نظام کی شہنشاہی صورتیں تھیں نہ تو خود مسلمان از سر نو جاگیردارانہ ماحول میں اپنی زندگی کا سفر شروع کرتے اور نہ اس دنیا پر نظام سرمایہ داری و اشتراکیت کی لعنتیں ہی مسلط ہو سکتیں۔ یقینی طور پر تاریخی ارتقا (Historical evolution.) کا وہ افسانہ جسے آج ناقدین پیش کر رہے ہیں بالکل مختلف ہوتا۔

اور جب میں یہ کہتا ہوں کہ گو مسلمانوں نے ملوکیت کو تو اپنا لیا تھا لیکن وہ اپنے فکری پس منظر کی وجہ سے اُس راستہ پر نہ بڑھ سکے جس پر اہل یورپ بڑھے ہیں۔ تو اسکا دراصل یہ مطلب ہے کہ ان کے ہاں "اسٹیٹ" اور "چرچ" (State and church.) میں کبھی وہ فرق و امتیاز قائم نہ ہو سکا جسے اہل یورپ نے ایک بڑی طویل جنگ کے بعد، صنعتی انقلاب سے بہت مدت پہلے قائم کر لیا تھا۔ اسلیے کہ ان کا فکری پس منظر یورپ والوں کی طرح محض مادی نہ تھا مسلمانوں نے تو اب کہیں جا کر مصطفٰے کمال پاشا کے عہد میں "خلافت" کو "اسٹیٹ" سے جدا کر کے

صحت کیلیے بھی ایک طولانی مدت درکار ہوگی، تاہم اس کا حساب صدیوں میں نہیں بلکہ برسوں کی گنتی میں ہوگا۔ ہم نے جس لمحہ سے اس غلطی کو معلوم کرلیا ہے اسی لمحہ سے ہماری نئی زندگی کا شمار شروع ہو چکا ہے اور جس طرح ہر نئی زندگی اپنا ایک ابتدائی دور رکھتی ہے اسی طرح اس کا بھی ایک ابتدائی دور ہوگا جس میں جدوجہد اور کشمکش حیات کے وہ تمام مناظر و مراحل سامنے آئینگے جو کسی زندگی کو اپنے قیام کے دوران میں پیش آیا کرتے ہیں۔ اس کا ایک خاص سبب ہے، وہ یہ کہ غلطی کی دریافت اور اس کا احساس بیک وقت ساری ملت پر نہیں ہوتا بلکہ اکثر و بیشتر اوقات میں ملت کا سب سے زیادہ ضعیف و پامال طبقہ، حالات کے غیر معمولی فشار کے باعث اسے سب سے پہلے معلوم و محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہندوستان کے محکوم و پس ماندہ مسلمان کو اسے سب سے اول کشف و تحقیق کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ترکی، ایران یا افغانستان کے مسلمان کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

اور جو بات پوری ملت کیلیے صحیح ہے بعینہ وہی کسی ایک طبقہ کیلیے بھی صحیح ہوگی۔ جس طرح پوری ایک ملت بیک وقت ایک ہی شے کو نہیں دیکھ سکتی، اسی طرح ایک طبقہ بھی ایک ہی وقت میں اپنی گمراہی پر متنبہ نہیں ہو سکتا۔ اس طبقہ میں سے بھی کوئی ایک فرد اٹھتا ہے جو اپنے ابنائے قوم کی توجہ کو اس غلطی کی طرف متوجہ کرتا ہے، اور پھر شدہ شدہ یکے بعد دیگرے افراد اسکی دعوت سے متاثر ہونا شروع ہوتے ہیں، اور ایک جماعت بنا کر ملت کے تمام اعضاء و جوارح کو اس سے باخبر کرتے ہیں، پھر ملت کا جسقدر حصہ انکے خیالات و افکار سے متاثر ہوکر ان سے آملتا ہے اسی کو اپنی قوت کا سرمایہ قرار دیکر وہ اپنی زندگی و زیست کے سامان فراہم کرنے میں لگ جاتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہر اس مزاحمت کو جو ان کے راستہ میں حائل ہوتی ہے مجاہدانہ نبرد آزمائی سے دور و نابود کرتے ہیں۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰۷۔ کوشش کی ہے۔ بہر حال مطالب کی وضاحت کے لحاظ سے جسقدر اس نوٹ میں گنجائش ہو سکتی تھی میں نے انکی توضیح کردی ہے۔ میں اس مضمون کو پوری تفصیل کیساتھ اپنی دوسری قسط میں چھیڑنے والا ہوں قارئین منتظر رہیں۔

یہی حال ہندوستان میں ان افراد کا ہے جنہوں نے اس غلطی کا انکشاف کیا ہے۔ وہ ابھی خال خال ہیں اور ایک دوسرے سے جدا اور آپس میں بالکل ناآشنا اور بے خبر ہیں۔ ان میں سے چند ایک نے اپنے مکاشفہ و شرح صدر کی کیفیت سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا بھی شروع کر دیا ہے، اور بعض نے نہایت بے صبری اور عجلت کے ساتھ خاص اپنے وجود کو مرکز قرار دیکر امت کے اجتماع و تنظیم کا اہتمام بھی اپنے ذمہ کر لیا ہے۔ اس پچھلی قسم کے افراد میں سے (علامہ) عنایت اللہ المشرقی اپنی تحریک خاکساریت کے ساتھ، عبدالمجید قریشی اپنی تحریک وحدت خطابہ مساجد کیساتھ اور کشفی شاہ نظامی اپنی تحریک تنظیم کیساتھ خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان افراد پر "ملوکیت بجائے خلافت" کی غلطی کا انکشاف کس کس شرح و عنوان سے ہوا ہے اور اسلام کے حقیقی پس منظر کو انہوں نے روشنی کی کس مقدار سے دیکھا ہے تاہم انکی اضطراری کیفیت سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ وہ "اسلام" کو موجودہ نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے کوئی الگ شے ضرور تصور کر رہے ہیں۔

اسلام کے بنیادی پس منظر کو سمجھنے اور تصور میں جگہ دینے کیلیے، روشنی کی جس مقدار کی ضرورت ہے، وہ یقیناً ایسے ماحول میں جو سرتاپا غیر اسلامی اور قسم قسم کی ضلالت اور گمراہیوں سے ترکیب پایا ہوا ہو، کسی ایک فرد کو پوری طرح میسر نہیں آسکتی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایسے ہی افراد کی پوری ایک جماعت موجود ہو جو اپنی جماعتی حیثیت سے پہلے کسی جگہ کو اپنا مرکز بنائے اور پھر تحقیق و تفکر اور دعوت و تبلیغ کا کام شروع کر دے۔ اس طرح یقینی طور پر متحد الفکر افراد کی ایک جماعت پہلے موجود ہو جائیگی جو اپنے افراد کی عملی کوتاہیوں اور انکی فکری لغزشوں کے مضر اثرات و نتائج سے بچ کر اپنی راہ نکالیگی، اور پھر ملت کے اس طبقہ یا حصہ کو متاثر کرنا شروع کر دیگی جو اب تک بے خبرانہ طور پر ضلالت و گمراہی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔

تجربہ نے یہ حقیقت ہم پر پوری طرح آشکار کر دی ہے کہ اس پایہ کا کوئی ایک شخص اپنی انفرادی

حیثیت میں اب تک کامیاب نہیں ہو سکا۔ اسکی تمام تر وجہ یہ ہے کہ جس حالت سے ہم آجکل گذر رہے ہیں وہ ہماری ملت کیلیے افتراق و انشقاق کی حالت ہے، جس میں ملت کے مختلف طبقات وعناصر اپنی انفرادی و فرقائی زندگی بسر کرنے کے خوگر ہو چکے ہیں، اور اس ایک کیفیت نے ان میں ایک دوسرے کے برخلاف انانیت وسرکشی کے مرض کو عام کر رکھا ہے۔ اس سبب سے جب کوئی ایسا فرد یکہ وتنہا میدان میں آتا ہے تو وہ اس سے متاثر ہونے کے بجائے اس کے دشمن اور رقیب بن جاتے ہیں جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ بے چارہ دب کر خاموش بیٹھ جاتا ہے اور یا پھر جھنجلا کر اپنا دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے اور فریقانہ عصبیت کے گرداب میں ہلاک ہو جاتا ہے۔

ایسے تنہا شخص کو ایک اور عارضہ بھی پیش آتا ہے، اور وہ خود اس کے اپنے نفس سے متعلق ہوتا ہے۔ اس کے نفس کی ہوا و ہوس اسے دھوکا دیتی ہے۔ وہ شروع ہی میں اپنے آپ کو کامل سمجھ لیتا ہے اور اس لئے بجائے اپنے ہی جیسے کامل انسانوں کی جستجو کرنے کے وہ اپنے گرد محض کارکنوں کو تلاش کرتا ہے اور جب اسے ایسے دو چار کارکن مل جاتے ہیں تو وہ انہی کو اپنی جماعت کی متاعِ بنیاد سمجھکر کام شروع کر دیتا ہے۔ اس آغاز کے بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ اسے محض کارکن نہیں بلکہ اپنے ہی جیسے ہم رتبہ وہم پایہ افراد کی ضرورت تھی۔ لیکن جب وہ احساس کی اس منزل پر انہیں ڈھونڈنے بیٹھتا ہے تو بوجہ اپنی ناواقفیت و بے خبری کے انہیں پا نہیں سکتا۔ اگر کوئی ایک آدھ سرا ہے اسے مل بھی جائے تو وہ شک اور تذبذب کی نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا ایک طرف ہٹ جاتا ہے اور اسکی معیت سے صاف انکار کر دیتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص اپنی کوششوں میں ناکام رہتا ہے اور اس ناکامی سے اپنی ابتدائی غلطی پر متنبہ ہونے کے بجائے وہ اسے افرادِ متعلقہ کی کمیٔ فہم یا ان کے شخصی بغض و عناد پر محمول کرتا ہے، اور اپنی طبیعت کے غصہ سے پیچ و تاب کھا کر اپنے حواریوں کی طرف واپس لوٹتا ہے اور انہیں فرقائی و جماعتی تعصب کا ہلاکت آفرین درس دینے میں ہمیشہ کیلیے

معروف و مشغول ہو جاتا ہے۔

پس تشتت و انتشار کے اس ماحول کے اندر کسی ایک فرد کیلیے خواہ وہ ایک بڑی حد تک کامل ہی کیوں نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ وہ ملت کے بیشتر و کثیر حصہ کو اپنے وجود سے متاثر کر سکے جب تک کہ خود اس جیسے ہم رتبہ و ہم پایہ افراد اس کے اردگرد جمع نہ ہو جائیں۔

واقعات کے اس غائر مطالعہ و مشاہدہ نے یہ حقیقت ان افراد پر جن کی زندگیوں کا ایک ایک لمحہ ملت کی تجدید و تعمیر کی فکری بنیادوں میں صرف ہو رہا ہے روز روشن کی طرح عیاں کر دی ہے اور یہ شکر و مسرت کا مقام ہے کہ ابھی اس حقیقت کو منکشف ہوئے تھوڑی ہی دیر گذری ہے کہ خدائے قدیر و رحیم نے وہ تمام سامان پیدا کرنے شروع کر دیے ہیں جنکی ایک ایسی جماعت کو، اپنے وجود کی تکمیل سے پہلے ضرورت ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے وسیع و عریض برِ اعظم کی سطح پر پھیلی ہوئی مخلوق میں سے ایسے گنتی کے چند افراد کو شناخت کرنا اور پھر ان کے اندر ایک مضبوط ارتباط پیدا کرنا جس سے وہ ایک جماعت کہلا سکیں، وسائل سفر و مراسلت کی افراط و ارزانی کے باوجود ملت کے موجودہ افتراق و تشتت کو دیکھتے ہوئے ایک بے ہودہ خیال اور باطل امید تھی چنانچہ ہمارا گذشتہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ باوجودیکہ ایک اچھی خاصی مدت سے اسلام کے صحیح تصور کو کئی رنگ و عنوان سے ملک کے ہر گوشہ و مقام سے پیش کیا جا رہا ہے، مگر پھر بھی ایک ایسی جماعت وجود و تکمیل نہیں پا سکی جو بحیثیت جماعت کے دین اسلام کو دنیا اور مسلمانوں کے اندر پھیلانے کا کام اپنے ذمہ لیتی اس کے لیے کسی جگہ ایک مقامی مرکز کی ضرورت تھی جہاں اس قسم کے تمام افراد یک جا و جمع ہو سکتے۔ اور جب اس قسم کی کوئی جگہ بھی موجود نہ تھی تو وہ جمع بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

کہا جا سکتا ہے کہ وحدت فکری کیلیے مقام کی قید و لبست عبث ہے لیکن یہ اسی وقت صحیح

ہو سکتا ہے جبکہ افراد کا انتشار و پھیلاؤ کسی مقام و مرکز سے وابستہ ہو - ابتدا ہی میں افراد کا ایک مستقل طور پر جمع ہو کر اپنا ایک مخصوص نظام قائم کرنا اور اپنے آپ کو صحیح معنوں میں ایک جماعت کی شکل میں ترتیب دینا بنیادی طور پر اشد ضروری ہے اور اگر یہ صحیح نہیں تو پھر کیوں اب تک کوئی ایسی جماعت معرض وجود میں نہ آسکی جبکہ وحدت فکری، جستجو و یافت کی دسترس سے باہر نہ تھی - درحقیقت قدرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ کوئی شے اسوقت تک خلق نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے لیے کوئی منزل و مقام موجود نہ ہو ٹھیک اسی طرح وحدتِ فکر و عمل کے لیے بھی ایک منزل اور قرارگاہ کی ضرورت ہے جہاں ایسے تمام افراد جمع کیے جا سکیں جو اپنی اجتماعی صفت کے ساتھ فکر و عمل کی یک رنگی کا ایک ایسا مظاہرہ پیش کریں جس سے ایک جہان صید و نخچیر ہو جائے -

اس قسم کا کوئی مرکز کبھی تو افراد کی اپنی جستجو و کاوش کے نتیجہ کے طور پر میسر و حاصل ہوتا ہے اور کبھی تائید و نصرتِ الٰہی اسے خود منتخب کرتی ہے اور کوئی آدمی اٹھ کر اسکی بنیاد ڈال دیتا ہے اور یہ شان ایزدی ہے کہ ضلع گورداسپور کے ایک نہایت ہی حقیر گاؤں جمال پور میں جو پٹھان کوٹ سے تقریباً چار میل جانب جنوب واقع ہے یہ سعادت چودھری نیاز علی خاں کے حصہ میں آتی ہے جو وہاں کا ایک راجپوت زمیندار ہے - نہ معلوم اس کے دل میں کیا امنگ اٹھتی ہے اور جذبات کا وہ کونسا طوفان برپا ہوتا ہے جو اسکی روح کو اسدرجہ بیدار کرتا ہے کہ وہ اپنی مملوکہ زمین کا ایک اچھا خاصہ ٹکڑا اسلام اور قرآن کی دعوت و تبلیغ کیلیے وقف کر دیتا ہے، وہ اس مبارک کام کی تعمیل و تکمیل کیلیے ہر اس شخصیت سے جویا و مستفسر ہوتا ہے جو اسکے علم و دانست میں اسلام اور اسلامیت کی شیدا اور درد آشنا ہوتی ہے - وہ صرف اسی پر بس نہیں کرتا بلکہ ان تمام سے مشورہ کر کے ایک ایسی ہستی کا کھوج لگاتا ہے جو معارف قرآن اور اسلامیات کے ابحار کی شناور ہوتی ہے - وہ اس سے اپنا مطلب بیان کرتا ہے اور اسے اس عظیم الشان اور اہم کام کا ذمہ لینے کی تکلیف و دعوت

پیش کرتا ہے۔

یہ شخصیت سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ہوتی ہے جو متواتر پانچ سال تک حیدر آباد دکن میں خود بھی اسی گوہرِ مقصود کیلیے بیتابانہ منتظر ہوتی ہے اور جب وہ مقصود اسکی نگاہوں کے عین سامنے آجاتا ہے تو وہ لبیک لبیک کہہ کر اسکی طرف جھپٹتی ہے۔ وہ چودھری صاحب کی دعوت کو ایک طویل خط و کتابت کے بعد قبول کر لیتی ہے اور جمال پور سے متصل اس سرزمین پر آکر ڈیرے ڈال دیتی ہے جس کا نام کام کی نشو و نمائی کے لحاظ سے "دارالاسلام" تجویز ہوا ہے۔

جماعت کی اولین بنیادوں کیلیے مرکز اور داعی دونوں کی ضرورت ہوتی ہے سو بحمد اللہ کہ وہ اس طرح پوری ہوئی۔ اب مرکز کے اندر داعی کا سب سے پہلا کام جماعت کی ترتیب و تشکیل کیلیے افراد کا جمع کرنا ہوتا ہے چنانچہ اس اہم کام کو بھی شروع کر دیا گیا ہے۔ ایک سچے داعی الی الحق کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ افراد کو اپنی ذات کی طرف نہیں بلکہ اپنے مقصد و منتہیٰ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ اپنے ہی جیسے بلکہ اپنے سے اعلیٰ اور برتر افراد کا حریص ہوتا ہے اور جب وہ انہیں ایک خاص تعداد میں پالیتا ہے تو "اِنَّ اَکرمکم عند اللہ اتقاکم" کے معیار و اصول پر وہ اپنی ذات کو چھوڑ کر اپنے دیگر ساتھیوں کو پرکھتا ہے اور اس کا ہر ایک ساتھی بھی اس امر میں اسکی تقلید کرتا ہے۔ دعوت الی الحق اب کسی کا ذاتی مسئلہ نہیں رہ جاتا بلکہ وہ اس مختصر سے حلقہ میں ایک اجتماعی مسئلہ بن جاتا ہے۔ ہر ایک اپنی ذات و وجود کو اپنے ساتھیوں کی ذات و وجود میں مدغم سمجھتا ہے اور پھر اس خمیر سے اس تنظیم

لہ چودھری صاحب کا ابتداء میں صرف اسیقدر خیال تھا کہ وہ محض درس و تبلیغ قرآن حکیم کیلیے اپنی جائداد کا ایک حصہ وقف کر دیں لیکن بعد میں جب انہوں نے اس موضوع پر مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے خط و کتابت کی تو موخر الذکر نے نہایت تفصیل کیساتھ انہیں وقت کی سب سے بڑی ضرورت سے واقف کیا، اور چونکہ ترجمان القرآن جو کہ مولینا موصوف کی زیر ادارت اسوقت حیدر آباد دکن سے نکل رہا تھا چودھری صاحب کو برابر پہنچتا رہتا تھا اس لیے مولینا کی وسعتِ نظری کے بہت جلد قائل ہو گئے اور انہیں کامل اختیار کیساتھ "دارالاسلام"

الٰہی کا وجود ظہور میں آتا ہے جو " واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا " کا عین مصداق ہوگی ۔ میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کی ذات میں اس نشان کو ظاہر و باہر دیکھتا ہوں - وہ اپنے وجود کی طرف لوگوں کو دعوت نہیں دے رہا بلکہ اعلاء کلمۃ الحق کیلئے اہل شوریٰ کی ترتیب و تاسیس عمل میں لا رہا ہے - اس نے کم از کم پچیس افراد کی حد مقرر کی ہے، اور جونہی کہ یہ مطلوبہ تعداد فراہم ہو جائیگی اس سرزمین مادہ و اصنام پرستی میں امارت و خلافت الٰہیہ کی داغ بیل ڈال دی جائیگی اور قرعہ اس دیوانے کے نام ڈالا جائیگا جو ہم سب سے زیادہ متقی ہوگا ۔

یہی وجہ ہے کہ مجھ جیسا سرکش نامطیع ہونیوالا شخص بھی جسکی زندگی کا ہر ایک باب سعیٔ عزائم کی راہ میں گذرا ہے، اس دعوت حق کے آگے تسلیم ہو چکا ہے اور اس مرکز کی طرف ہجرت کر آیا ہے جو اسکی زندگی کا عین مقصود تھا - اس وقت تک کہ اس پچیس کا کورم پورا نہیں ہو جاتا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہی وہ شخص ہونگے جو " دارالاسلام " کے تمام امور کا جو " وقف " کی نگرانی و انتظام سے علاوہ ہیں ادارہ و اہتمام کرینگے اور اس اثناء میں وہ تمام افراد جو اس دعوت سے متاثر ہو کر ہجرت کر آئینگے ان کے رفیق و مشاور ہونگے ۔

ممکن ہے کہ " دارالاسلام " بہت ہی جلد ایک بڑے قریہ یا شہر کی شکل اختیار کرے تاہم ابتداءً میں " مرکز " کی طرف سے صرف انہی افراد کا استقبال کیا جائیگا جنہیں وہ خود دعوت دیگا - اس طرح مرکز اور داعی گویا ان افراد کیلئے بمنزلہ ایک سگنل اور نشان کے ہیں جنہوں نے اسلام کے صحیح تصور کا ایک پورا خاکہ اپنے ذہنوں میں اتار رکھا ہے اور جو اس طلب میں پہلے ہی سے حیران و سرگرداں پھر رہے تھے کہ کب کوئی مقام و مرکز نظر آئے اور وہ وہاں جمع ہو کر اسلام کے اس صحیح تصور کو عملی رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کریں ۔

(باقی)

رسائل و مسائل

دیہات میں نماز جمعہ اور مسلکِ حنفی

(۲)

یہی وجہ ہے کہ ان شرائط کے شرائطِ وجوب تو درکنار شرائط ادا ہونے میں بھی کلام کیا جاسکتا ہے، اور کیا گیا ہے۔ خود علمائے احناف نے وقتاً فوقتاً ان شرائط میں ترمیمیں کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلک حنفی میں اتنی گنجائش ہے کہ حسب موقع و ضرورت، ان میں قواعد شرعیہ کو ملحوظ رکھ کر مزید ترمیم کی جا سکے۔

قابلِ ترمیم شرائط سب سے پہلے سلطان کی شرط کو لیجیے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے تو اسکے شرطِ جمعہ ہونے سے ابتدا ہی میں انکار کر دیا تھا مگر خود فقہائے حنفیہ بھی بعد میں اس شرط کے اسقاط پر مجبور ہو گئے۔ جب تک ایسے سلاطین و امراء برسرِ اقتدار رہے جو کسی حد تک اپنے فرائضِ دینی کا احساس رکھتے تھے، اس وقت تک تو حنفیہ کو اپنے اس فتوے میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہ آئی کہ "جمعہ کی اقامت اذن سلطان کیساتھ مشروط ہے اور سلطان کے بغیر اقامتِ جمعہ جائز نہیں"۔ مگر جب دین سے غافل حکام و سلاطین کا دور آیا تو فقہاء نے محسوس کیا کہ شرط سلطان نے ایک دینی فرض کو دنیوی سلاطین کی مرضی پر موقوف کر دیا ہے، حتیٰ کہ اگر وہ نہ چاہیں تو فرض ہی ساقط ہوا جاتا ہے۔ اسلیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر حکام غفلت برتیں تو جمعہ مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قائم کیا جائے۔ پھر وہ دور آیا جب اسلامی ممالک پر کفار مسلط ہونے لگے اور بڑی بڑی اسلامی

جماعتیں سلطانِ اسلام سے کلیۃً محروم ہوگئیں۔ اس وقت فقہاء کو یہ فتویٰ دینا پڑا کہ :

واما فی بلاد علیہا ولاۃ کفار فیجوز للمسلمین اقامۃ الجمع والاعیاد ویصیر القاضی قاضیا بتراضی المسلمین ویجب علیہم طلب وال مسلم (شامی)	رہے وہ ممالک جن پر کافر حکام مسلط ہیں تو ان میں مسلمانوں کے لیے اقامت جمعہ و عیدین کا خود انتظام کر لینا جائز ہے اور وہاں مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے جو قاضی مقرر ہو وہ قاضی ہو سکتا ہے، اور ان پر مسلمان حاکم کی طلب واجب ہے۔

اس طرح وہی شرط، جو پہلے شرطِ ادا تھی شرطِ وجوب بھی نہ رہی، اور تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ سلطانِ اسلام کی موجودگی سرے سے شرط جمعہ ہی نہیں ہے۔ یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علم الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اسلیے اس کے احکام تمام ازمنہ و احوال کیلیے مناسب ہوتے ہیں۔ مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا، نہ اسکی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے، لہذا اسکے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ جن لوگوں کو اللہ نے تفقہ فی الدین کی نعمت سے نوازا تھا وہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بھی اس راز کو سمجھتے تھے اور تغیر احوال کیساتھ اپنے مذہبِ فقہی کے جزوی احکام میں مناسب ترمیم کر دیتے تھے، اور انکی ترمیمات، اجتہادی ترمیمات ہونیکے باوجود اسی سسٹم کا ایک جزء بن جاتی تھیں جسکے وہ متبع ہوتے تھے۔ مگر جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں، وہ مجتہد کی نص کو خدا اور رسول کی نص کی طرح محکم سمجھتے ہیں، اور اُسکی بنا پر وہ خدا اور رسول کے عائد کردہ فرائض کو مسلمانوں پر سے ساقط کر دینے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

اسی قسم کے بعض جامد فقہاء نے انگریزی تسلط کے بعد ہندوستان میں فتوے دینے شروع کر دیے تھے کہ اب یہاں اقامت جمعہ جائز نہیں۔ کیونکہ سلطان اسلام کے اٹھ جانے سے اقامت

جمعہ کی ایک شرط مفقود ہو گئی ہے۔ مگر خوش قسمتی سے اس وقت ہندوستان میں ایسے علماء بھی موجود تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علمِ حق سے سرفراز فرمایا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر سختی کے ساتھ اس تحریک کی مخالفت کی، حتیٰ کہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے زیادہ درشت الفاظ میں، یہاں تک لکھ دیا :-

انہ لاشك فی وجوب الجمعة وصحة ادائها فی بلاد الهند التی غلبت علیها النصاری وجعلوا علیها ولاة کفارا او ذلك باتفاق المسلمین وتراضیهم ومن افتیٰ بسقوط الجمعة لفقد شرط السلطان فقد ضل واضل۔	اس میں کوئی شک نہیں کہ بلادِ ہند میں جہاں نصاریٰ کا غلبہ ہو گیا ہے اور انہوں نے کافر حکام مقرر کر دیے ہیں، جمعہ واجب ہے اور مسلمانوں کے باہمی اتفاق اور رضامندی سے اس کو ادا کرنا درست ہے۔ جس کسی نے سقوطِ جمعہ کا فتویٰ دیا وہ خود بھی گمراہ ہوا اور اس نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام ہندوستان کے حنفی، عالم اور عامی سب، اس ملک میں جمعہ پڑھ رہے ہیں، حالانکہ ہدایہ کی یہ عبارت اب بھی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے کہ لا یجوز اقامتها الا للسلطان او لمن امرہ السلطان۔ اگر احوال کے لحاظ سے مجتہدین کے احکام میں جزوی ترمیم کرنا بھی غیر مقلدیت ہے، تو ایسی غیر مقلدیت میں تمام احناف ہند پہلے ہی مبتلا ہو چکے ہیں۔

شرطِ مصر شرطِ سلطان کی طرح شرطِ مصر کو بھی امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ جنگلوں اور خیموں اور عارضی فرودگاہوں میں جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔ یہ امر بھی متفق علیہ ہے کہ جمعہ کیلئے ایک نوع کا تمدن ضروری ہے۔ مگر اس امر میں اختلاف ہے کہ جمعہ کتنی بڑی بستی میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جس جگہ کم از کم چالیس آدمیوں کی مستقل بستی ہو (یعنی وہ گرمی جاڑے میں مہاجرت نہ کرتے رہتے ہوں)

وہ مقام اقامت جمعہ کا ہے۔ امام مالک کے نزدیک چالیس آدمیوں سے کم کی بستی میں بھی اقامت جمعہ ہو سکتی ہے۔ مگر حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اقامت جمعہ کیلیے "مصر جامع" ہونا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ "مصر جامع" کا لفظ تو نص میں آیا ہے۔ مگر جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، اسکی کوئی حد، منصوص نہیں ہے۔ اسی لیے اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور اجتہاد ہی سے مختلف زمانوں میں مختلف حدیں مقرر کی گئی ہیں؛ حتیٰ کہ ایک ہی امام نے مختلف اوقات میں اس کی مختلف حدیں بیان کی ہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ سے تین مختلف تعریفیں منقول ہیں:

(۱) مصر جامع وہ ہے جہاں امیر اور قاضی احکام اسلامی کی تنفیذ اور حدود شرعی کی اقامت کرتا ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ سے بھی ایک قول اسی مضمون کا منقول ہے۔ اور کرخی وغیرہ فقہا نے اس کو اختیار کیا ہے۔

(۲) مصر وہ مقام ہے جسکے باشندے (یعنی وہ لوگ جن پر جمعہ فرض ہے) اگر سب کے سب وہاں کی سب سے بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں تو وہ انکے لیے کافی نہ ہو اور ایک دوسری مسجد بنانے کی ضرورت پڑ جائے۔ اس رائے کو ابن شجاع نے پسند کیا ہے۔ اور ابو عبداللہ الثلجی نے بھی اسکو اختیار کیا ہے۔

(۳) مصر وہ جگہ ہے جہاں کم از کم دس ہزار کی آبادی ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں تعریفیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ایک ہی امام نے ان کو مختلف اوقات میں اختیار کیا ہے۔ پھر مختلف فقہاء نے اپنی پسند کے مطابق ان میں سے بعض کو رد اور بعض کو قبول کیا حالانکہ وہ مجتہد مطلق نہ تھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ سے ایک قول تو وہ منقول ہے جو اوپر بیان ہوا۔ اور انہی سے دوسرا قول یہ روایت کیا گیا ہے کہ:

"مصر وہ ہے جہاں سڑکیں اور بازار ہوں، محلّے ہوں، کوئی والی ظالم سے مظلوم کا انصاف لینے والا ہو اور کوئی عالم موجود ہو جس سے مسائل شرعیہ میں رجوع کیا جا سکے"[1]

اسطرح امام اعظم نے دو مرتبہ اور امام ابو یوسف نے تین مرتبہ مصر کی تعریف میں ترمیم فرمائی۔ اس کے بعد بھی مختلف لوگوں نے مختلف تعریفیں کیں اور ترمیمات کا سلسلہ جاری رہا مثلاً علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

"ہمارے بعض مشائخ کا قول ہے۔ (بلا اس تصریح کے کہ وہ مشائخ ہیں کون؟) کہ مصر وہ ہے جہاں ہر پیشے کا آدمی اسی مقام پر کام کر کے گذر بسر کر سکتا ہو، اور اسے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے"[2]

ایک اور تعریف برجندی نے کنز العباد سے نقل کی ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک:-

"مصر وہ ہے جہاں ہر روز ایک بچہ پیدا ہو اور ایک آدمی مرے"

ایک اور تعریف کنز العباد میں کسی نامعلوم الاسم فقیہ سے نقل کی گئی ہے کہ:-

"مصر وہ ہے جسکی مردم شماری بغیر انتہائی تکلیف اور سخت مشقت کے معلوم نہ کی جا سکے"

اسی قسم کی اور تعریفات کا سلسلہ قریب قریب ہر زمانے میں برابر جاری رہا ہے، حتیٰ کہ ہم سے بہت قریبی دور میں بھی مختلف علماء نے مختلف تعریفیں کی ہیں جنکی تعداد درجنوں سے متجاوز ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کی تعریف خود حنفیہ میں مختلف فیہ ہے، مصر کوئی متعین چیز نہیں ہے، اگر اسکی کوئی مزید تعریف کی جائے تو حنفیت سے خارج ہو کر غیر مقلدیت کے دائرے میں چلے جانے کا خطرہ نہیں ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ اگر حنفیہ ہی کے اصول پر معنی مصر کا تعین اسطرح

[1] ملاحظہ ہو، ہدایہ، فتح القدیر و شرح العنایہ علی الہدایہ جلد اول صفحہ ۴۰۹ و ۴۱۰

[2] ملاحظہ ہو کتاب المبسوط جلد دوم صفحہ ۲۳۔

کیا جائے کہ اس سے اسقاطِ فرض کے بجائے اقامتِ فرض میں مدد ملتی ہو تو وہ اہلِ تقویٰ کیلیے زیادہ قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

آخری تنقیح اب میں آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتا ہوں جس پر مسئلے کے تصفیہ کا مدار ہے۔ اس تنقیح کے الفاظ پھر ایک مرتبہ ملاحظہ فرما لیجیے:

"کیا یہ جائز ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کیلیے ایک ایسا نظام اختیار کیا جا سکے جو فقہائے حنفیہ کے فتاویٰ سے چاہے مختلف ہو، مگر ان کے اصول کے خلاف نہ ہو؟"

اوپر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ اگر شرطِ سلطان کو بالکل ساقط کر دینے، اور مصر کی تعریفات میں پے در پے ترمیمات کرنے کے باوجود حنفیت کے دائرے سے کوئی شخص خارج نہیں ہوتا، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس مذہب کے دائرے میں ادائے فرض کسی ایسے نظام کی گنجائش نہ ہو، جو اصول مذہب حنفی پر پورا اترتا ہو۔ لہٰذا اب مجھ پر صرف اس امر کا بارِ ثبوت رہ جاتا ہے کہ جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں وہ اصولِ مذہب حنفی کے مطابق ہے۔

میں نے جہاں تک احکام پر غور کیا ہے، اس سے مجھے شریعت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کو منتشر طور پر چھوٹے چھوٹے قریوں میں الگ الگ ادا کرنا مقاصد جمعہ کیلیے مفید نہیں ہے، اسلیے شارع نے حکم دیا کہ جمعہ "مصر جامع" میں قائم کیا جائے۔ "مصرِ جامع" کا لفظ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد کوئی ایسی بستی ہے جو چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو یکجا کرنے والی، یا جامع الجماعات ہو، یعنی جہاں بہت سی چھوٹی بستیوں کے لوگ اکٹھے ہو کر جمعہ ادا کریں۔ اس غرض کیلیے دوکانوں اور بازاروں، اور آبادی کی تعداد، اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو مصر کی جامعیت میں کوئی دخل نہیں ہے، نہ اقامت جمعہ سے ان اجزائے مصر کا براہِ راست کوئی تعلق ہے کہ جمعہ کی نماز اپنی صحت کیلیے بازار اور بہت سی دوکانیں مانگتی ہو۔ اسکے لیے تو صرف ایسی بستی کی ضرورت ہے جو مرکزی حیثیت

رکھتی ہو تاکہ اطراف کے منتشر مسلمان وہاں مجتمع ہو جائیں۔ اگر کوئی بڑا شہر موجود ہو، جسے تمدن نے خود ہی ایک مرکزی حیثیت دے رکھی ہو تو بہت اچھا، ورنہ امام وقت جس بستی کو مناسب سمجھے "مصر جامع" قرار دے کر اطراف کے لوگوں کو وہاں جمع ہونے کا حکم دے سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ ولو مصر الامام موضعاً وامرھم بالاقامۃ فیہ جاز ولو منع اھل مصر ان یجمعوا لم یجمعوا، یعنی "اگر امام کسی جگہ کو مصر ٹھیرا دے اور لوگوں کو وہاں جمعہ قائم کرنے کا حکم دے تو وہاں نماز جائز ہے، اور اگر کسی مقام کے باشندوں کو جمعہ قائم کرنے سے منع کر دے تو ان کو قائم نہ کرنا چاہیے" (جلد اول صفحہ ۴۰۹) لیکن اگر امام موجود نہ ہو تو جس طرح مسلمانوں کی تراضی سے جمعہ قائم ہو سکتا ہے، اور جس طرح انکی تراضی سے قاضی مقرر ہو سکتا ہے، اسی طرح انکی تراضی، امام کی قائم مقام بن کر کسی بستی کو "مصر جامع" بھی ٹھیرا سکتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کونسی نص مانع ہے، یا یہ بات اصول میں سے کس اصل کے خلاف پڑتی ہے۔

مصر جامع کی شرط لگانے سے شارع کا منشا تو یہ تھا کہ دیہات کے لوگ فریضۂ جمعہ کو منتشر طور پر ادا کرنے کے بجائے ایک مرکزی مقام پر مجتمع ہو کر ادا کریں۔ مگر نہ معلوم کن وجوہ سے اس شرط کے معنی بالکل الٹ دیے گئے، اور دیہات کے لوگوں کو اجتماع کا حکم دینے کے بجائے، الٹا فریضۂ جمعہ ہی سے سبکدوش کر دیا گیا۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہوئی کہ لفظ "مصر" سے علماء کا ذہن "شہر" کے عرفی مفہوم کی طرف منتقل ہو گیا، اور انہوں نے حدیث کا مطلب یہ سمجھا کہ جمعہ صرف شہروں میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ پھر چونکہ شہر بہت دور دور ہوتے ہیں، اور مسافت بعید طے کر کے ان کی طرف جانے سے آدمی مسافر کی تعریف میں آجاتا ہے، جس پر جمعہ از روئے نص فرض ہی نہیں ہے، اس لیے بات یہاں تک پہنچ گئی کہ مضافات شہر کے سوا باقی تمام دیہات کے باشندوں پر سے فریضۂ جمعہ ساقط ہے۔ حالانکہ جس چیز کو قرآن اور احادیث مشہورہ، اور سنت واجماع نے مسلمانوں

پر فرضِ عین ٹھیرایا ہو اسے دیہات کے رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کیلیے غیر فرض بنا دینا اور وہ بھی ایک مختلف فیہ اور مبہم المعنی حدیث کی بنا پر، کسی طرح مقتضائے احتیاط نہیں ہے۔ حدیث نے تو اقامت جمعہ کیلیے محض "مصر جامع" کی شرط لگائی ہے۔ مردم شماری کی ایک خاص مقدار اور دوکانوں کی ایک خاص تعداد اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی تصریح اس میں نہیں ہے۔ لہذا یہ چیزیں بجائے خود اقامت جمعہ کیلیے شرطِ منصوص نہیں ہیں، بلکہ ان کو اس مفہوم نے شرط بنایا ہے جو لفظِ مصر سے علماء نے سمجھا، با الفاظ دیگر فریضۂ منصوصہ کو دیہات کے مسلمانوں پر سے ساقط کرنے والی چیز خود نص نہیں ہے، بلکہ وہ مفہوم ہے جو نص سے اخذ کیا گیا ہے۔ اگر اس مفہوم کے سوا نص کا کوئی اور مفہوم نہ ہوتا، یا نص اپنے الفاظ میں صریح ہوتی، تو بلا شبہ اس کی بنا پر اسقاطِ فرض درست ہوتا۔ مگر جبکہ اس کا کوئی دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے، تو میرے نزدیک تقویٰ اور خشیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اسقاطِ فرض کا راستہ کھولنے والے مفہوم کی بہ نسبت، اقامتِ فرض کا راستہ کھولنے والا مفہوم زیادہ لائق ترجیح ہے۔

میں نے مصر کی جو تعریف کی ہے، اس کو اختیار کرنے سے قریب قریب ہر دیہاتی مسلمان، بلکہ خانہ بدوش مسلمان کیلیے بھی صحیح شرعی طریق پر جمعہ ادا کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ دیہی علاقوں کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کیا جائے جن کا دور ۵ سے ۸ - ۹ میل تک ہو۔ ان حلقوں میں ایک مرکزی مقام کو مسلمان باشندوں کی باہمی رضامندی سے مصر جامع قرار دیا جائے، اور وہاں سے آٹھ آٹھ نو نو میل تک کے دیہات کو توابع مصر قرار دیکر اعلان کر دیا جائے کہ ان کے مسلمان باشندے وہاں آکر جمعہ کی نماز ادا کریں۔ یہ نظام نہ صرف احادیث صحیحہ کی رو سے بلکہ فقہاء حنفیہ کی تصریحات سے بھی بالکل ایک صحیح نظام ہوگا۔ فقہائے توابع مصر کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ بعض لوگوں نے توابع مصر کی حد ۹ میل مقرر کی ہے، بعض نے دو میل

بعض نے ۶ میل، اور بعض کہتے ہیں کہ "جس مقام سے مصر میں آکر نماز ادا کرنیکے بعد آدمی رات ہونے سے پہلے پہلے اپنے گھر پہنچ سکے وہ توابع مصر میں شمار ہوگا" صاحب بدائع نے اسی تعریف کو پسند کیا ہے، اور حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

عن النبی صلعم قال الجمعة علی من	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ اس
آواہ اللیل الی اھلہ	پر فرض ہے جو نماز پڑھ کر رات سے پہلے
	اپنے گھر پہنچ سکے۔

اور بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:۔

کان الناس ینتابون الجمعة	لوگ جمعہ کے روز اپنی فرودگاہوں اور
من منازلھم و العوالی	عوالی سے آیا کرتے تھے۔

اور ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	حضور نے فرمایا کہ سنو! تم میں سے ایک
الا ھل عسیٰ احدکم ان یتخذ الصبة	شخص بکریوں کا ریوڑ لیے ہوئے چارے
من الغنم علی رأس میل او میلین	کی تلاش میں تو میل دو میل چلا جائے مگر
فیتعذر علیہ الکلاء فیرتفع ثم تجیٔ	جب جمعہ آئے تو اس میں شریک ہونے کیلیے
الجمعة فلا یجیٔ ولا یشھدھا (ثلاثا)	یہاں نہ آئے۔ (یہ جملہ آپ نے تین مرتبہ دھرایا،
حتی یطبع علی قلبہ	پھر فرمایا) ایسے شخص کے دل پر مہر لگائی جائیگی۔

ان احادیث سے اور فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ توابع مصر کی حد چھ سات میل یا اسکے قریب قریب ہے، جہاں کے باشندے نماز پڑھ کر شام تک اپنے گھر پہنچ سکیں،

اور اس حد کے اندر رہنے والے تمام مسلمانوں پر، خواہ وہ مستقل دیہات میں رہتے ہوں، یا خانہ بدوش ہوں، مصر جامع میں حاضر ہو کر نماز جمعہ ادا کرنا فرض ہے، جیسا کہ ابن ہمام نے فتح میں لکھا ہے کہ:

ومن کان من مکان من توابع المصر فحکمه حکم اهل المصر فی وجوب الجمعة علیه بان یاتی المصر فلیصلها فیه (جلد اول ص ۴۱۱)	اور جو شخص توابع مصر میں سے کسی جگہ ہو اس کے لیے خود اہلِ مصر کی طرح جمعہ واجب ہے، اسے مصر میں حاضر ہو کر نماز ادا کرنی چاہیے۔

خلاصۂ کلام اب میں اپنے مدعا کی تسہیل کیلیے مناسب سمجھتا ہوں کہ پچھلے مباحث کا ایک خلاصہ آپکے سامنے پیش کردوں، تاکہ بیک نظر آپ کو معلوم ہو جائے کہ اقامت جمعہ فی القریٰ کیلیے جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں وہ کہاں تک مسلک حنفی کے خلاف یا موافق ہے۔

۱- حنفیہ کے نزدیک الگ الگ دیہات میں جمعہ قائم کرنا جائز نہیں —— میں بھی اسی کا قائل ہوں۔

۲- حنفیہ کی رائے میں جمعہ صرف "مصر جامع" میں قائم ہونا چاہیے —— میں اس امر میں بھی ان کا متبع ہوں۔

۳- حنفیہ صرف دو قسم کے مقامات کو مصر جامع تسلیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جن کو تمدن نے خود بخود جامع بنا دیا ہو، جیسے شہر اور قصبے۔ دوسرے وہ جن کو امام وقت جمعہ قائم کرنیکے لیے مصر ٹھیرا دے —— اس میں صرف اتنی ترمیم مینے تجویز کی ہے کہ فقدانِ امام کی وجہ سے عامۂ مسلمین کے اتفاق کو امام کا قائم مقام قرار دیا جائے، اور انکے اس اختیار کو تسلیم کیا جائے کہ وہ کسی علاقہ میں کسی مقام کو مصر جامع قرار دے لیں۔ چونکہ اقامت جمعہ کے معاملہ میں حنفیہ نے مسلمانوں کی تراضی کو امام کا

قائم مقام تسلیم کیا ہے، لہذا کوئی وجہ نہیں کہ تعیین مصر کے معاملہ میں ایسا کرنا حنفیہ کے اصول کے خلاف سمجھا جائے ۔

۴ - حنفیہ نے اہلِ قریٰ کے حق میں جمعہ کی عدم فرضیت کا حکم صرف اس لیے لگایا ہے کہ امراء و سلاطین نے اقامت جمعہ کیلیے کوئی نظام قائم کرنے سے بے پروائی برتی، جسکی وجہ سے جمعہ محض پہلی قسم کے امصار جامعہ، یعنی شہروں اور بڑے بڑے قصبوں تک محدود ہو کر رہ گیا، اور چونکہ شہر دور دور ہوتے ہیں، اسلیے مجبوراً حنفیہ کو یہ فتویٰ دینا پڑا کہ دیہات کے باشندوں پر جمعہ فرض نہیں - ورنہ یہ ظاہر ہے کہ دیہاتی کا محض دیہاتی ہونا، اُس پر سے جمعہ کے ساقط ہونے کا سبب نہیں ہے - چنانچہ جو دیہات توابع مصر میں ہوں، یعنی "مصر" سے سات آٹھ یا نو میل کی حد میں ہوں، ان پر حنفیہ کے نزدیک جمعہ اسی طرح فرض ہے جس طرح اہلِ مصر پر فرض ہے ---- میں کہتا ہوں کہ جو فتویٰ اس مجبوری کی بنا پر دیا گیا ہے، اسکے سبب کو دور کرنا ہم پر لازم ہے تاکہ سبب زائل ہونیکے ساتھ فتویٰ خود بخود زائل ہو جائے اور مسلمانوں کیلیے ایک فرضِ مکتوب کے ادا کرنیکا راستہ کھلے - بخلاف اس کے بعض علما فرماتے ہیں کہ سبب کو قائم رکھو تاکہ وہ پرانا فتویٰ جو قدامت کی وجہ سے مقدس ہو چکا ہے، اٹل رہے، چاہے فرضِ مکتوب کی رحمتوں سے کروروں مسلمان محروم ہو جائیں ۔

تغیر فتویٰ کی دینی ضرورت بحث کے اس خلاصہ کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقامت جمعہ کا جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں، اسکے لیے مذہب حنفی میں پوری گنجائش موجود ہے، اور اسے ناجائز ٹھیرانے کیلیے حقیقتہً کوئی بنیاد موجود نہیں ہے - اب میں مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کا ایک نظام تجویز کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی ہے، اور شرعی نقطۂ نظر سے اس ضرورت کی اہمیت کیا ہے ۔

ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کی حکومت تھی، خواہ وہ شرعی حیثیت سے کتنی ہی ناقص ہو، بہرحال اسکی وجہ سے اسلام کا اجتماعی نظام کسی نہ کسی حد تک ضرور قائم تھا۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ اسلامی قوانین مسلمان حاکموں کے ذریعہ سے نافذ ہوتے تھے، اور ہماری قوم کے عوام و خواص شہری اور دیہاتی اپنی زندگی کے معاملات میں انکی طرف رجوع کرتے تھے۔ افرادِ امت کو ایک دینی سر رشتہ سے وابستہ رکھنے کا یہ ایک قوی ذریعہ تھا۔ مگر جب وہ نیم اسلامی حکومت بھی ختم ہو گئی تو امت کو باہم مربوط رکھنے کیلیے کوئی نظام باقی نہ رہا۔ اب لے دے کر ہماری جمعیت، بلکہ حیاتِ ملی کا تمام تر انحصار اُن روابط پر رہ گیا ہے جو عقائد، عبادات اور تمدن و معاشرت کے شرعی قوانین سے پیدا ہوتے ہیں۔ انہی کی طاقت سے ہماری طاقت ہے، ان کی کمزوری سے ہماری کمزوری ہے، اور انکی موت سے ہماری موت ہے۔ ابھی تک بیشمار مخالف اسباب کی کارفرمائی کے باوجود شہروں میں یہ روابط نسبتہً کافی طاقتور ہیں، مگر دیہات میں مسلمانوں کی جو چھوٹی چھوٹی منتشر آبادیاں لاکھوں میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہیں، اُن کو دینی رابطہ میں جوڑنے والا سر رشتہ اب اس درجہ کمزور ہو چکا ہے کہ ایک اشارہ میں ٹوٹ سکتا ہے۔ وہ منتشر بھیڑوں کیطرح ہر گمراہ کن بھیڑیے کیلیے آسان شکار بن گئے ہیں، اور جہاں وہ قلیل التعداد ہیں، وہاں تو انکی جان و مال اور عزت و آبرو تک محفوظ نہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح اگر جلدی نہ کی گئی تو آپ دیکھینگے کہ دیہات کی مسلمان آبادیاں فوج در فوج امت سے کٹتی چلی جائینگی اور ان کا کٹ جانا گویا امت کا ختم ہو جانا ہے، کیونکہ ہماری آٹھ کروڑ کی آبادی میں سے کم از کم ساڑھے چھ کروڑ افراد دیہات میں آباد ہیں۔

اب اگر محض غیر قوموں کی تقلید کرنی ہو تو دیہات سدھار کے بہت سے پروگرام بن سکتے ہیں، اور بن ہی رہے ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسے کسی پروگرام سے اسلامی جمعیت اور دینی شیرازہ بندی ممکن نہیں۔ اسلامی جمعیت تو صرف رابطۂ دینی ہی کو مضبوط کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے، اور اسکو مضبوط کرنیکے جتنے طریقے ہیں اُن میں سے کوئی بھی اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ دیہات میں اقامتِ جمعہ کا نظام قائم نہ کر دیا جائے۔ دینی اصلاح و تنظیم کی راہ میں پہلا قدم، منتشر افراد اور پراگندہ ٹکڑیوں میں دین کے واسطہ سے ربط و مرکزیت پیدا کرنا ہے اور اس ربط و مرکزیت کو پیدا کرنیکی

خطباتِ جمعہ

خطبۂ اولیٰ - ۱۹ ربیع الاول ۵۷ھ

حمد و نعت کے بعد:-

برادران اسلام! اس سے پہلے میں نے ایک خطبہ میں آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کے سامنے مسلمان کی صفات بیان کرونگا۔ یعنی یہ بتاؤنگا کہ مسلمان ہونے کیلیے کم سے کم شرطیں کیا ہیں؟ آدمی کو کم از کم کیسا ہونا چاہیے کہ وہ مسلمان کہلائے جانیکے قابل ہو۔

اس بات کو سمجھنے کیلیے، سب سے پہلے آپ کو یہ جاننا چاہیے کہ کفر کیا ہے اور اسلام کیا ہے؟ کفر یہ ہے کہ آدمی خدا کی فرماں برداری سے انکار کردے، اور اسلام یہ ہے کہ آدمی صرف خدا کا فرمان بردار ہو، اور ہر ایسے طریقے، یا قانون، یا حکم کو ماننے سے انکار کردے جو خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے خلاف ہو۔ اسلام اور کفر کا یہ فرق قرآن مجید میں صاف صاف بیان کردیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (المائدہ-۷)

یعنی "اور جو شخص خدا کی اتاری ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہ کرے ایسے ہی لوگ دراصل کافر ہیں"

فیصلہ کرنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ عدالت میں جو مقدمہ جائے، بس اسی کا فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق ہو۔ بلکہ دراصل فیصلہ سے مراد وہ فیصلہ ہے جو ہر شخص اپنی زندگی میں ہر وقت کیا کرتا ہے

ہر موقع پر تمہارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ فلاں کام کیا جائے یا نہ کیا جائے - فلاں بات اس طرح کی جائے یا اُس طرح کی جائے - فلاں معاملہ میں یہ طریقہ اختیار کیا جائے یا وہ طریقہ اختیار کیا جائے - ایسے موقعوں پر ایک طریقہ خدا کی کتاب اور اسکے رسول کی سنت بتاتی ہے - اور دوسرا طریقہ انسان کے اپنے نفس کی خواہش، یا باپ دادا کی رسمیں، یا انسانوں کے بنائے ہوئے قانون بتاتے ہیں - اب جو شخص خدا کے بتائے ہوئے طریقہ کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ کے مطابق کام کرنیکا فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل کفر کا طریقہ اختیار کرتا ہے - اگر اس نے اپنی ساری زندگی ہی کیلیے یہی ڈھنگ اختیار کیا ہو تو وہ پورا کافر ہے - اگر بعض معاملات میں وہ خدا کی ہدایت کو مانتا ہو، اور بعض میں اپنے نفس کی خواہشات یا رسم و رواج یا انسانوں کے قانون کے مقابلہ میں خدا کے قانون کو چھوڑ دیتا ہو، تو جسقدر وہ خدا کے قانون سے بغاوت کرتا ہے اسی قدر کفر میں مبتلا ہے کوئی آدھا کافر ہے - کوئی چوتھائی کافر ہے - کسی میں دسواں حصہ کفر کا ہے اور کسی میں بیسواں حصہ - غرض جتنی خدا کے قانون سے بغاوت ہے اتنا ہی کفر بھی ہے -

اسلام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ آدمی صرف خدا کا بندہ ہو - نہ نفس کا بندہ - نہ باپ دادا کا بندہ - نہ خاندان اور قبیلہ کا بندہ - نہ مولوی صاحب اور پیر صاحب کا بندہ - نہ زمیندار صاحب اور تحصیلدار صاحب اور مجسٹریٹ صاحب کا بندہ - نہ خدا کے سوا کسی اور صاحب کا بندہ - قرآن مجید میں ارشاد ہے :-

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (آلِ عمران - ۷)

یعنی اے نبی اہلِ کتاب سے کہو کہ آؤ، ہم تم ایک ایسی بات پر اتفاق کریں جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، یعنی جو تمہارے نبی بھی بتا گئے ہیں، اور خدا کا نبی ہونیکی حیثیت سے میں بھی

وہی بات کہتا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ ہم ایک تو خدا کے سوا کسی کی پوجا اور بندگی نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ خدائی میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی انسان کسی انسان کو خدا کے بجائے اپنا مالک اور اپنا آقا نہ بنائے۔ یہ تین باتیں اگر وہ نہیں مانتے تو ان سے کہدو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلمان ہیں۔ یعنی ہم ان تینوں باتوں کو مانتے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔

یعنی "کیا وہ خدا کی اطاعت کے سوا کسی اور کی اطاعت چاہتے ہیں۔ حالانکہ خدا وہ ہے کہ زمین اور آسمان کی ہر چیز چارونا چار اسی کی اطاعت کر رہی ہے اور سب کو اسی کی طرف پلٹنا ہے"

ان دونوں آیتوں میں ایک ہی بات بیان کی گئی ہے۔ یعنی یہ کہ اصلی دین خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری ہے۔ خدا کی عبادت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بس پانچ وقت اسکے آگے سجدہ کر لو۔ بلکہ اسکی عبادت کے معنی یہ ہیں کہ رات دن میں ہر وقت اسکے احکام کی اطاعت کرو۔ جس چیز سے اس نے منع کیا ہے اس سے رک جاؤ۔ جس چیز کا اس نے حکم دیا ہے، اس پر عمل کرو۔ ہر معاملہ میں یہ دیکھو کہ خدا کا حکم کیا ہے۔ یہ نہ دیکھو کہ تمہارا اپنا دل کیا کہتا ہے، تمہاری عقل کیا کہتی ہے، باپ دادا کیا کر گئے ہیں، خاندان اور قبیلہ والوں کی کیا مرضی ہے، جناب مولوی صاحب قبلہ اور جناب پیر صاحب قبلہ کیا فرماتے ہیں، اور فلاں صاحب کا کیا حکم ہے اور فلاں صاحب کی کیا مرضی ہے۔ اگر تم نے خدا کے حکم کو چھوڑ کر کسی کی بات بھی مانی تو گویا خدائی میں اسکو شریک کیا۔ اسکو وہ درجہ دیا جو صرف خدا کا درجہ ہے۔ حکم دینے والا تو صرف خدا ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔ بندگی کے لائق تو صرف وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، اور جسکے بل بوتے پر تم زندہ ہو۔ زمین اور آسمان کی ہر

چیز اسی کی اطاعت کر رہی ہے۔ کوئی پتھر کسی پتھر کی اطاعت نہیں کرتا۔ کوئی درخت کسی درخت کی اطاعت نہیں کرتا۔ کوئی جانور کسی جانور کی اطاعت نہیں کرتا۔ پھر کیا تم جانوروں اور درختوں اور پتھروں سے بھی گئے گذرے ہو گئے کہ وہ تو صرف خدا کی اطاعت کریں، اور تم خدا کو چھوڑ کر انسانوں کی اطاعت کرو ـــ یہ ہے وہ بات جو قرآن کی ان دونوں آیتوں میں بیان فرمائی گئی ہے۔

اب میں آپ سے یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ کفر اور گمراہی دراصل نکلتی کہاں سے ہے۔ قرآن مجید ہم کو بتاتا ہے کہ اس کمبخت بلا کے آنے کے تین راستے ہیں:

پہلا راستہ انسان کے اپنے نفس کی خواہشات ہیں؛

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ، اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ـ (القصص - ۵)

یعنی "اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جس نے خدا کی ہدایت کے بغیر اپنے نفس کی خواہش کی پیروی کی۔ ایسے ظالم لوگوں کو خدا ہدایت نہیں دیتا"

مطلب یہ ہے کہ سب سے بڑھ کر انسان کو گمراہ کرنے والی چیز انسان کے اپنے نفس کی خواہشات ہیں۔ جو شخص خواہشات کا بندہ بن گیا، اس کے لیے خدا کا بندہ بننا ممکن ہی نہیں۔ وہ تو ہر وقت یہ دیکھے گا کہ مجھے روپیہ کس کام میں ملتا ہے، میری عزت اور شہرت کس کام میں ہوتی ہے، مجھے لذت اور لطف کس کام میں حاصل ہوتا ہے، مجھے آرام و آسائش کس کام میں ملتی ہے۔ بس یہ چیزیں جس کام میں ہونگی اُسی کو وہ اختیار کریگا، چاہے خدا اس سے منع کرے۔ اور یہ چیزیں جس کام میں نہ ہوں، اسکو وہ ہرگز نہ کریگا، چاہے خدا اس کا حکم دے۔ تو ایسے شخص کا خدا اللہ تبارک و تعالیٰ نہ ہوا، اس کا اپنا نفس ہی اسکا خدا ہو گیا۔ اس کو ہدایت کیسے مل سکتی ہے۔ اسی بات کو دوسری جگہ قرآن میں یوں بیان کیا گیا ہے:

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ ۔ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ۔ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ۔ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۔

یعنی "اے نبی، تم نے اس شخص کے حال پر غور بھی کیا جس نے اپنے نفس کی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے؟ تم کیا ایسے شخص کی نگرانی کر سکتے ہو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے بہت سے لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔"

نفس کے بندے کا جانوروں سے بدتر ہونا ایسی بات ہے جس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں۔ کوئی جانور آپ کو ایسا نہ ملیگا جو خدا کی مقرر کی ہوئی حد سے آگے بڑھتا ہو۔ ہر جانور وہی چیز کھاتا ہے جو خدا نے اسکے لیے مقرر کی ہے۔ اسی قدر کھاتا ہے جسقدر اسکے لیے مقرر کی ہے۔ اور جتنے کام جس جانور کے لیے مقرر ہیں بس وہ اتنے ہی کرتا ہے۔ مگر یہ انسان ایسا جانور ہے کہ جب یہ اپنی خواہش کا بندہ بنتا ہے تو وہ حرکتیں کر گذرتا ہے جن سے شیطان بھی پناہ مانگے۔

یہ تو گمراہی کے آنے کا پہلا راستہ ہے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ باپ دادا سے جو رسم و رواج، جو عقیدے اور خیالات، جو رنگ ڈھنگ چلے آرہے ہوں، آدمی ان کا غلام بن جائے اور خدا کے حکم سے بڑھ کر انکو سمجھے، اور اگر ان کے خلاف خدا کا حکم اسکے سامنے پیش کیا جائے تو کہے کہ میں تو وہی کرونگا جو میرے باپ دادا کرتے تھے اور جو میرے خاندان اور قبیلہ کا رواج ہے۔ جو شخص اس مرض میں مبتلا ہے وہ خدا کا بندہ کب ہوا۔ اسکے خدا تو اسکے باپ دادا اور اسکے خاندان اور قبیلے کے لوگ ہیں۔ اس کو یہ جھوٹا دعویٰ کرنیکا کیا حق ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ قرآن کریم میں اس پر بھی بڑی سختی کے ساتھ تنبیہ کی گئی ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا

اَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُونَ (البقرہ - ۲۱)

"اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ جو حکم خدا نے بھیجا ہے اسکی پیروی کرو، تو انہوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس بات کی پیروی کرینگے جو ہمیں باپ دادا سے ملی ہے - اگر ان کے باپ دادا کسی بات کو نہ سمجھے ہوں اور راہِ راست پر نہ ہوں تو کیا یہ پھر بھی انہی کی پیروی کیے چلے جائینگے؟"

دوسری جگہ فرمایا:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ قَالُوا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (المائدہ - ۱۴)

"اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس فرمان کی طرف جو خدا نے بھیجا ہے، اور آؤ رسول کے طریقہ کی طرف، تو انہوں نے کہا کہ ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے - کیا یہ باپ دادا ہی کی پیروی کیے چلے جائینگے چاہے ان کو کسی بات کا علم نہ ہو اور وہ سیدھے راستے پر نہ ہوں؟ اے ایمان والو! تم کو تو اپنی فکر ہونی چاہیے - اگر تم سیدھے راستے پر لگ جاؤ تو کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہیں کوئی نقصان نہ ہوگا پھر تم سب کو خدا کی طرف واپس جانا ہے" اور اس وقت خدا تم کو تمہارے اعمالِ نیک و بد سب دکھا دیگا"

یہ ایسی گمراہی ہے جس میں تقریباً ہر زمانے کے جاہل لوگ مبتلا رہے ہیں، اور ہمیشہ خدا کے رسولوں کی ہدایت کو ماننے سے یہی چیز انسان کو روکتی رہی ہے - حضرت موسیٰ نے جب خدا کی شریعت کی طرف بلایا تھا، اس وقت بھی لوگوں نے یہی کہا تھا -

أَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا (یونس - ۸)

"کیا تو ہمیں اس راستہ سے ہٹانا چاہتا ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے"۔

حضرت ابراہیمؑ نے جب اپنے قبیلہ والوں کو شرک سے روکا تو انہوں نے بھی یہی کہا تھا:

وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ (الانبیاء - ۵) "ہم نے تو اپنے باپ دادا کو انکی پرستش ہی کرتے ہوئے پایا ہے"۔

غرض اسی طرح ہر نبی کے مقابلے میں لوگوں نے یہی حجت پیش کی ہے کہ تم جو کہتے ہو یہ ہمارے باپ دادا کے طریقہ کے خلاف ہے، اسلیے ہم اسے نہیں مانتے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْهِ اٰبَآءَكُمْ ۔ قَالُوْۤا اِنَّا بِمَاۤ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِیْنَ (الزخرف - ۲)

یعنی "ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ جب کبھی ہم نے کسی بستی میں کسی ڈرانیوالے یعنی پیغمبر کو بھیجا تو اُس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انہی کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ پیغمبر نے ان سے کہا کہ اگر میں اس سے بہتر بات بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے تو کیا پھر بھی تم باپ دادا ہی کی پیروی کیے چلے جاؤ گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اُس بات کو نہیں مانتے جو تم لے کر آئے ہو۔ بس جب انہوں نے یہ جواب دیا تو (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ) ہم نے بھی انکو خوب سزا دی اور اب دیکھ لو کہ ہمارے احکام کو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے"۔

یہ سب کچھ بیان کرنیکے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یا تو باپ دادا ہی کی پیروی کرلو یا پھر ہمارے ہی حکم کی پیروی کرو۔ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ نہیں ہوسکتیں۔ مسلمان رہنا چاہتے ہو تو

سب کو چھوڑ کر صرف اس بات کو مانو جو ہم نے بتائی ہے:

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ کَانَ الشَّیْطٰنُ یَدْعُوْھُمْ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ۔ وَمَنْ یُّسْلِمْ وَجْھَہٗٓ اِلَی اللّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی وَاِلَی اللّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔ وَمَنْ کَفَرَ فَلَا یَحْزُنْکَ کُفْرُہٗ اِلَیْنَا مَرْجِعُھُمْ فَنُنَبِّئُھُمْ بِمَا عَمِلُوْا۔ (لقمان - ۳)

یعنی "اور جب ان سے کہا گیا کہ اس حکم کی پیروی کرو جو خدا نے بھیجا ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں ہم تو اس بات کی پیروی کرینگے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے، چاہے شیطان ان کو عذاب جہنم ہی کی طرف کیوں نہ بلا رہا ہو۔ جو کوئی اپنے آپ کو بالکل خدا کے سپرد کر دے اور نیکوکار ہو اس نے تو مضبوط رسی تھام لی اور آخر کار تمام معاملات خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ اور جس نے انکار کیا تو اے نبی تم کو اس کے کفر سے رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ سب ہماری طرف واپس آنیوالے ہیں پھر ہم انہیں انکے اعمال کا نتیجہ دکھا دینگے"

یہ گمراہی کے آنے کا دوسرا راستہ تھا۔ اب تیسرا راستہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ انسان جب خدا کے حکم کو چھوڑ کر دوسرے لوگوں کا حکم ماننے لگتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ فلاں شخص بڑا آدمی ہے، اسکی بات پکی ہوگی، یا فلاں شخص کے ہاتھ میں میری روٹی ہے اس لیے اسکی بات ماننی چاہیے، یا فلاں شخص بڑا صاحب اقتدار ہے اسلیے اسکی فرمانبرداری کرنی چاہیے، یا فلاں صاحب اپنی بددعا سے مجھے تباہ کر دینگے یا اپنے ساتھ جنت میں لے جائینگے اسلیے جو وہ کہیں وہی صحیح ہے، یا فلاں قوم بڑی ترقی کر رہی ہے اسلیے اسکے طریقے اختیار کرنے چاہییں، تو ایسے شخص پر خدا کی ہدایت کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (الانعام۔۱۴)

"اور اگر تو نے ان بہت سے لوگوں کی اطاعت کی جو زمین میں رہتے ہیں تو وہ تجھ کو خدا کے راستہ سے بھٹکا دینگے۔"

یعنی آدمی سیدھے راستہ پر اُسی وقت ہو سکتا ہے جب اسکا ایک خدا ہو۔ سینکڑوں ہزاروں خدا جس نے بنا لیے ہوں، اور جو کبھی اِس خدا کے کہے پر چلتا ہو، تو کبھی اُس خدا کے کہے پر، وہ سیدھا راستہ کہاں پا سکتا ہے۔

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ گمراہی کے تین بڑے بڑے سبب ہیں۔

ایک نفس کی بندگی۔

دوسرے باپ دادا اور خاندان اور قبیلے کے رواجوں کی بندگی۔

تیسرے، عام طور پر دنیا کے لوگوں کی بندگی جن میں دولت مند لوگ اور حکام وقت، اور بناوٹی پیشوا، اور غیر قومیں، سب ہی شامل ہیں۔

یہ تین بڑے بڑے بُت ہیں، جو خدائی کے دعویدار بنے ہوئے ہیں۔ جو شخص مسلمان بننا چاہتا ہو اسکو سب سے پہلے ان تینوں بتوں کو توڑنا چاہیے، پھر وہ حقیقت میں مسلمان ہو جائیگا ورنہ جس نے یہ تینوں بت اپنے دل میں بٹھا رکھے ہوں، اس کا بندۂ خدا ہونا مشکل ہے۔ وہ دن میں پچاس وقت کی نمازیں پڑھ کر اور دکھاوے کے روزے رکھ کر، اور مسلمانوں کی سی شکل بنا کر انسانوں کو دھوکا دے سکتا ہے، خود اپنے نفس کو بھی دھوکا دے سکتا ہے کہ میں پکا مسلمان ہوں، مگر خدا کو دھوکا نہیں دے سکتا۔

خطبۂ ثانیہ | الحمد للّٰہ العلی العظیم والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم

بھائیو! آج میں نے آپکے سامنے جن تین بتوں کا ذکر کیا ہے انکی بندگی اصلی شرک ہے۔

آپ نے پتھر کے بت توڑ دیے۔ اینٹ اور چونے سے بنے ہوئے بت خانے ڈھا دیے۔ مگر سینوں میں جو بت خانے بنے ہوئے ہیں، انکی طرف کم توجہ کی۔ سب سے زیادہ ضروری، بلکہ مسلمان ہونے کیلیے اولین شرط، ان بتوں کو توڑنا ہے۔ اگرچہ میرا خطاب تمام مسلمانوں سے ہے، اور مجھے یقین ہے کہ ساری دنیا میں اور تمام ہندوستان میں مسلمان جس قدر نقصان اٹھا رہے ہیں وہ اپنی تین بتوں کی پوجا کا نتیجہ ہے، مگر چونکہ اس وقت میرے سامنے میرے پنجابی بھائی ہیں، اسلیے میں خاص طور پر ان سے کہتا ہوں کہ آپ کی تباہی اور آپ کی ذلت اور مصیبت کی جڑ یہ تین چیزیں ہیں جو آپ نے ابھی مجھ سے سنی ہیں۔ آپ اس پنجاب کی سرزمین میں ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ ہیں۔ اس صوبہ کی آبادی میں آدھے سے زیادہ آپ ہیں اور آدھے سے کم میں دوسری قومیں ہیں۔ مگر اتنی بڑی قوم ہونیکے باوجود یہاں آپ کا کوئی وزن نہیں۔ بعض نہایت قلیل التعداد قوموں کا وزن آپ سے بڑھ کر ہے۔ اسکی وجہ پر بھی آپ نے کبھی غور کیا؟ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ نفس کی بندگی، خاندانی رواجوں کی بندگی، اور خدا کے سوا دوسرے انسانوں کی بندگی نے آپ کی طاقت کو اندر سے کھوکھلا کر دیا ہے۔

آپ میں راجپوت ہیں، گکھڑ ہیں، مغل ہیں، جاٹ ہیں، اور بہت سی قومیں ہیں۔ اسلام نے ان سب قوموں کو ایک قوم، ایک دوسرے کا بھائی، ایک پختہ دیوار بننے کیلیے کہا تھا جسکی اینٹ سے اینٹ جڑی ہوئی ہو۔ مگر آپ اب بھی وہی پرانے ہندوانہ خیالات لیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ جس طرح ہندوؤں میں الگ الگ گوتریں ہیں، اسی طرح آپ میں بھی قبیلے قبیلے الگ ہیں۔ آپس میں مسلمانوں کی طرح شادی بیاہ نہیں۔ ایک دوسرے سے برادری اور بھائی چارہ نہیں۔ زبان سے آپ ایک دوسرے کو مسلمان بھائی کہتے ہیں۔ مگر حقیقت میں آپ کے درمیان وہی سب امتیازات ہیں جو اسلام سے پہلے تھے۔ ان امتیازات نے آپ کو ایک مضبوط دیوار نہیں بننے دیا۔

آپ کی ایک ایک اینٹ الگ ہے - آپ نہ مل کر اٹھ سکتے ہیں اور نہ مل کر کسی مصیبت کا مقابلہ کرسکتے ہیں - اگر اسلام کی تعلیمات کے مطابق آپ سے کہا جائے کہ توڑ دو ان امتیازات کو، اور آپس میں مل کر ایک ہو جاؤ، تو آپ کیا کہینگے؟ بس وہی ایک بات، یعنی ہمارے باپ دادا سے جو رواج چلے آرہے ہیں ان کو ہم نہیں توڑ سکتے - اس کا جواب خدا کی طرف سے کیا ملتا ہے بس یہی کہ تم نہ توڑو ان رواجوں کو، تم نہ چھوڑو ہندوؤں کی تقلید کو - ہم بھی تم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینگے، اور تمہاری کثرت تعداد کے باوجود تم کو ذلیل وخوار کرکے دکھائینگے -

اللہ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ تمہاری وراثت میں لڑکے اور لڑکیاں سب شریک ہیں - آپ اس کا جواب کیا دیتے ہیں؟ یہ کہ ہمارے باپ دادا کے قانون میں لڑکے اور لڑکیاں شریک نہیں ہیں - اور ہم خدا کے قانون کے بجائے باپ دادا کا قانون مانتے ہیں - خدارا مجھے بتائیے کہ کیا اسلام اسی کا نام ہے - آپ سے کہا جاتا ہے کہ اس خاندانی قانون کو توڑ دیجے - آپ میں سے ہر شخص کہتا ہے کہ جب سب توڑینگے تو میں بھی توڑونگا - ورنہ اگر دوسروں نے لڑکی کو حصہ نہ دیا، اور میں نے دیدیا تو میرے گھر کی دولت تو دوسروں کے پاس چلی جائیگی، مگر دوسرے کے گھر کی دولت میرے گھر میں نہ آئیگی - غور کیجیے کہ اس جواب کے کیا معنی ہیں - کیا خدا کے قانون کی اطاعت اسی شرط سے کی جائیگی کہ دوسرے اطاعت کریں تو آپ بھی کرینگے؟ کل آپ کہینگے کہ دوسرے زنا کرینگے تو میں بھی کرونگا - دوسرے چوری کرینگے تو میں بھی کرونگا - غرض دوسرے جب تک سب گناہ نہ چھوڑینگے، میں بھی اس وقت تک سب گناہ کرتا رہونگا - بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں تینوں بتوں کی پرستش ہورہی ہے - نفس کی بندگی بھی ہے - باپ دادا کی بندگی بھی، اور مشرک قوموں کی بندگی بھی - اور ان تینوں کے ساتھ اسلام کا دعوی بھی ہے -

اسی قسم کے اور بہت سے امراض آپ میں پھیلے ہوئے ہیں، اور ان سب میں آپ یہی دیکھینگے کہ کہیں ایک بت کی پرستش ہے اور کہیں دو بتوں کی، اور کہیں تینوں بتوں کی جب یہ بت پوجے جارہے ہوں، اور ان کے ساتھ اسلام کا دعوی بھی ہو تو آپ کیسے امید کرسکتے ہیں کہ آپ پر اُن رحمتوں کی بارش ہوگی جن کا وعدہ سچے مسلمانوں سے کیا گیا ہے۔

درود وسلام ودعا

دو جلیل القدر کتابیں کوڑیوں کے مول

تفسیر ابن کثیر (عربی مصری) اہل علم کو معلوم ہے کہ بسیط ارض پر اس پایہ کی کوئی تفسیر کسی زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی گویا جسکے پاس یہ کتاب ہو اس کے پاس فن تفسیر اور معارف قرآن کا معتمد ترین ذخیرہ موجود ہے۔ پہلے اسکی قیمت چالیس روپے تھی اب جدید طبع ہوکر آئی ہے اور قیمت میں حیرت انگیز کمی کردیگئی ہے یعنی اسوقت صرف ساڑھے بارہ روپے میں آپ کو مل سکتی ہے۔

فتح القدیر شرح ہدایہ (مصری) علمار کرام اور ارباب فتوی جانتے ہیں کہ فقہ حنفی میں یہ کتاب اعلیٰ درجہ کی معتمد اور مستند مانی جاتی ہے اس کے مصنف حضرت امام ابن ہمامؒ کو مجتہد فی المذہب تسلیم کیا گیا ہے۔ پہلے اس کی قیمت ساٹھ روپے تھی ابھی ابھی جدید طبع ہوکر آئی ہے اور اس وقت صرف بائیس روپے میں آپ کو مل سکتی ہے۔ عنایہ شرح ہدایہ اور حاشیہ چلپی بھی حسب سابق اس کے ساتھ ہے۔

کتب بالا اور ہر قسم کی علمی و دینی کتابیں مناسب قیمتوں پر ملنے کا پتہ: دفتر الفرقان بریلی (یوپی)

مطبوعات

الارشاد مرتبہ حاجی بشیر احمد صاحب - ضخامت ۴۴ صفحات، شرح چندہ عام خریداروں سے ایک روپیہ آٹھ آنے، طلبہ سے ایک روپیہ ملنے کا پتہ:- سید عبد الحمید شاہ بخاری مہتمم ماہنامہ الارشاد - امرت سر-

یہ ماہانہ رسالہ امرت سر سے نکل رہا ہے جس کا مقصد، مغربیت، خاکساریت اور قادیانیت کے مہلک طوفانوں کو روکنا اور اسلامی تعلیمات کو افرادِ ملت میں پھیلانا ہے۔ اپنے اس نصب العین میں وہ بالکل تیغ بے نیام ہے اور بغیر کسی مداہنت کے خاکساری اور مرزائی مشن کے اصل چہرہ سے فریب کا ایک ایک پردہ اٹھانا چاہتا ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ان عظیم الشان فتنوں کی بیخ کنی وقت کے اہم ترین فرائض میں سے ہے۔ گو زبان بہت درشت ہے، مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پنجاب کے فتنوں کا علاج خود اہلِ پنجاب ہی بہتر جانتے ہیں۔

خالد مرتبہ مولوی سید احمد صاحب دیوبندی - حجم ۴۰ صفحات، چندہ سالانہ عمہ/ طلبہ سے عہ/ ملنے کا پتہ رسالہ خالد دیوبند۔

یہ ایک علمی، ادبی اور مذہبی ماہنامہ ہے جو خدمت قوم کا مقصد لیکر دیوبند سے نکلا ہے اس کے علمی مقالات اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے بجائے زیادہ تر عام پڑھے لکھوں کیلیے ہوا کرینگے۔ رسالہ کے اندر معیاری نظمیں بھی ہیں، تاریخ اسلام کے روشن صفحات اس پرچہ کی خاص زینت ہیں جن سے قوم اپنے بہت سے بھولے ہوئے سبق یاد کر سکتی ہے۔ رسالہ مذکور نے ملک کے مذہبی رسائل کی کمی اور انکی لاخیری پر ایک ہمہ گیر ماتم کیا ہے۔ گو اسے اس حد تک مایوس نہ ہونا چاہیئے مگر پھر بھی اس کا

شکوہ بجا ہے کہ مذہبی رسائل کی اکثریت عوام کی پسند کے آگے جھک گئی ہے - وہ مسلمانوں میں وسعت نظر اور صحیح مذہبی روح پیدا کرنے کے بجائے ان کی جہالت سے کھیل، کھیل رہی ہے، وہی فرسودہ مباحث، وہی فتنہ انگیز مناظرانہ مقالے اور وہی امن سوز مکابرے جن کے ناپاک ہاتھوں سے پوری امتِ مرحومہ کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے ان مذہبی رسائل کا سامانِ زیست بنے ہوئے ہیں محض اس وجہ سے کہ "عوام زیادہ سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کر سکیں" اور اپنی دوکان چلتی رہے -

خالد کا مطمح نظر ماشاء اللہ بہت بلند ہے - دردمند مسلمانوں کو ایسے رسالوں کی قدر کرنی چاہیے -

الادب مرتبہ مولوی ضیاء النبی صاحب عباسی دیوبندی - ضخامت ۳۰ صفحات - شرح چندہ سالانہ عہ - مقام اشاعت :- اشرف العلوم کانپور

یہ ایک ادبی اور مذہبی ماہنامہ ہے - اب تک اس کے چھ نمبر نکل چکے ہیں، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ زبان آسان اور عام فہم ہے - کم استعداد رکھنے والے بھی بخوبی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، رسالہ معنوی اور صوری دونوں لحاظ سے غنیمت ہے، معیار متوسط، مضامین میں تنوع، لیکن ترتیب میں اصلاح کی کافی گنجائش -

---

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کر کے شائع کیے گئے ہیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ١٣٥٦ھ سے رجب ١٣٥٦ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالت، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ہے، جس سے مسلمانان ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاہئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رہی ہے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ہیں۔

ایک روپے میں	٥ نسخے	علاوہ محصول ڈاک
نو روپے میں	٥٠ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار
پندرہ روپے میں	١٠٠ نسخے	,,

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے ہے۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ٢٥ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ہے۔

شعبۂ اشاعت دارالاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

مدیر ترجمان القرآن کی تالیفات

الجہاد فی الاسلام

مختصر فہرست مضامین حسبِ ذیل ہے :-

۱- اسلامی جہاد کی حقیقت اسمیں بتایا گیا ہے کہ قرآن کی تعلیم جہاد کن اہم حقائق پر مبنی ہے اور نظامِ تمدن میں رُوحِ جہاد کا کیا مرتبہ ہے
۲- مدافعانہ جنگ وہ اغراض جن کے لئے قرآن نے دفاعی جنگ کا حکم دیا ہے۔
۳- مصلحانہ جنگ اصلاحی جنگ کے اصُول و مقاصد کی تشریح اور ان اعتراضات کا جواب جو اس نوع کی جنگ پر کیے جاتے ہیں
۴- اشاعت اسلام اور تلوار- دعوت و تبلیغ کے متعلق اصُول تعلیم اسلامی کی تشریح اور اس امر کی تحقیق کہ اشاعتِ اسلام میں تلوار کا کیا حِصّہ ہے۔
۵- قوانینِ جنگ اسلام سے قبل کے وحشیانہ طریقہائے جنگ اور اُن میں اسلام کی اصلاحات۔
۶- جنگ دوسرے مذاہب میں- جنگ کے متعلق ہندو مذہب، بودھ مت، یہودیت اور مسیحیت کی تعلیمات پر مفصل تبصرہ۔
۷- جنگ اور تہذیب جدید- بین الاقوامی قانونِ جنگ کی تفصیل اور اسلامی قانون سے اسکا مقابلہ- قیمت مجلد ۵؍- غیر مجلد للعہ ۴؍

رسالۂ دینیات

یہ رسالہ ہائی اسکول کی آخری جماعتوں میں تعلیم پانے والے لڑکوں اور لڑکیوں کیلئے لکھا گیا ہے- اِس میں تعلیم دینیات کا بالکل جدید طرز اختیار کیا گیا ہے- مُسلمان نوجوانوں کو کالج کی منزل میں داخل ہونے سے پہلے یہ رسالہ پڑھا دینا نہایت ضروری ہے- اسمیں بہترین عقلی دلائل کے ساتھ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اصُولِ شریعت کو سمجھایا گیا ہے اور ان شبہات کو رفع کیا گیا ہے جو زمانۂ جدید کے دماغوں میں عمُوماً پیدا ہوتے ہیں-

طلبہ کے علاوہ عام ناظرین اور خصوصاً جدید تعلیم یافتہ حضرات کے لیے بھی اس رسالہ کا مُطالعہ فائدہ سے خالی نہیں نیز علما بھی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ رسالہ انکو بتائیگا کہ اس دور میں اسلام کو پیش کرنیکا صحیح طریقہ کیا ہے۔

قیمت ۱۰؍ محصُول ڈاک ۲؍ خرچ وی پی ۳؍

دفتر ترجمان القرآن لاہور سے طلب کیجیے

سو بل و تصاویر پین پریس بل روڈ لاہور میں طبع ہوئے